چودہ مسائل
اس کتاب کو پڑھ کر سینکڑوں افراد حق کو پہچان گئے
مصنف: عبدالکریم مشتاق

انتساب

یہ کتاب میں اپنی والدۂ ماجدہ مسماۃ اللہ وسائی مرحومہ و مغفورہ کے نام منسوب کرتا ہوں جن کی پُرخلوص کوششوں اور عمدہ تربیت سے مجھے اِس کارِ خیر میں حصّہ لینے کا موقع نصیب ہوا۔ مومنین سے استدعا ہے کہ مرحومہ کے لئے دعائے خیر فرمائیں اور ایصالِ ثواب کے لئے سورۂ فاتحہ پڑھیں۔ شکریہ

ملتمس

عبدالکریم مشتاق

3/6/11/8 - ناظم آباد۔ کراچی ۱۸

فہرست

نمبر شمار		عنوانات	صفحہ نمبر

نمبر شمار		عنوانات	صفحہ نمبر

پہلا سوال

سوال نمبر ۱ تم لوگ روتے پیٹتے کیوں ہو کیا اسلام کی شریعت رونے پیٹنے اور آہ و فغاں کرنے کو جائز قرار دیتی ہے؟

جواب: عزاداری کے سلسلہ میں فی الحال ہم صرف تین پہلو مدنظر رکھتے ہوئے ہر ایک پر علیحدہ علیحدہ روشنی ڈالتے ہیں۔

(۱) اثبات از عقل و فطرت۔

(۲) اثبات از کتب اہل سنۃ والجماعت

(۳) اثبات از قرآن

اثبات از عقل و فطرت سوال میں چند افعال مذکورہ ہیں یعنی رونا، پیٹنا، آہ و فغاں کرنا ان میں سے ہر ایک فعل کو علیحدہ علیحدہ دیکھتے ہیں کہ آیا یہ خلافِ عقل و فطرت انسانی ہیں یا مطابق عقل اور مقتضائے فطرت؟

رونا اس ضمن میں سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ رونا ایک قدرتی امر ہے۔ انسان لاکھ کوشش کرے کہ روئے مگر نہیں رو سکتا تا وقتیکہ اس کے حالات یا ماحول اس کے لئے رونے کے اسباب پیدا نہ

کریں جب کوئی شخص بناوٹی رونا بھی چاہے تو بھی مجبور ہو کر اسے اپنے خیالات کو غم کی کیفیت کی طرف متوجہ کرنا پڑتا ہے لہٰذا تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ رونا مقتضائے فطرت ہے اس لئے عقل کے خلاف نہیں۔

(۲) اگر کوئی صاحب ہوش و حواس انسان بازار میں سے روتا ہوا آپ کے سامنے سے گذرے اور آپ اپنے پہلو میں حساس دل رکھتے ہیں تو فطری طور پر آپ کے دل میں اس رونے والے کے لئے ہمدردی کے جذبات پیدا ہوں گے اور حساس دل کم از کم یہ تقاضا ضرور کرے گا کہ اس سے دریافت کیا جائے کہ کس مصیبت سے آنکھیں اشکبار ہوئی ہیں پھر اگر آپ کے لئے ممکن ہوگا تو اس کی مدد کریں گے اور دلاسہ دیں گے کیونکہ آپ جانتے ہیں کہ رونا وہی ہے جو تکلیف یا مصیبت میں ہو۔ محض رونے کی وجہ سے کسی کو دیوانہ قرار دینا عقل سلیم رکھتے ہوئے آپ کیسے جائز سمجھیں گے؟ اس کے برعکس اگر کوئی شخص بازار میں ہنستا ہوا جا رہا ہو یا آپ کو دیکھ کر ہنستا ہو تو آپ کے دل میں ہمدردی کے جذبات پیدا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جیسا کہ روزمرہ کا تجربہ اور مشاہدہ ہے۔

(۳) جب کوئی حساس انسان کوئی پُر درد افسانہ یا کہانی پڑھتا ہے تو بعض مقامات پر اس کی آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں حالانکہ اس کو یقین کامل ہوتا ہے کہ وہ کہانی یا افسانہ فرضی ہے لیکن تقاضائے فطرت اسے رُلا دیتا ہے اور رقیق القلب انسان دردناک فرضی قصوں پر بھی محض احساس

ہی سے اشک بار ہو جاتا ہے۔

(۴) اگر خدانخواستہ آپ کو کسی کے ہاں صفِ ماتم میں شریک ہونا پڑے متوفی کے اہل و عیال رونے پیٹنے میں مصروف ہوں تو یقیناً ماحول کا اثر آپ پر بھی ہوگا۔ پریشانی اور غم کے اثرات آپ پر بھی اثر انداز ہوں گے۔ بلکہ اگر آپ رونا چاہیں گے اور آنسو نہ نکلیں تو یہ کوشش کریں گے کہ کم از کم رونے والی صورت ہی بن جائے۔ اس کے برخلاف اگر آپ رونے کی بجائے ہنسنا شروع کر دیں تو نتیجہ جو ہوگا خود ہی سمجھ لیں۔ یعنی آپ کا رونا تو اہلِ ماتم سے ہمدردی کا ثبوت ہوگا اور ہنسنا بے دردی اور سنگدلی کا مظاہرہ قرار پائے گا۔

(۵) عقلمند حضرات کے لئے ایک اور مثال پیش کرتا ہوں کہ بالفرض کسی کو کسی آفیسر سے کوئی حاجت پیش آتی ہے اور اس کے سامنے رو کر اس کی مدد مانگتا ہے تو وہ کچھ نہ کچھ مدد ضرور کرتا ہے اور اگر اس کے پاس جا کر بلاوجہ ہنسنا شروع کر دیا جائے تو وہ برانگیختہ ہوئے بغیر نہ رہے گا۔

(۶) حکماء اور اطباء کا قول ہے کہ رونے سے غبارِ دل دُھل جاتا ہے اور انسان کی طبیعت دماغی اور قلبی لحاظ سے درست اور ہلکی پھلکی رہتی ہے لیکن دردناک واقعات پر نہ رونا طبی نقطہ نظر سے مضر اور بعض مواقع پر خطرناک ہوتا ہے بلکہ کبھی جان لیوا بھی ثابت ہو جاتا ہے۔

(۷) کوئی انسان ہنستے ہوئے پیدا نہیں ہوتا بلکہ جب دنیا میں آتا ہے

روتا ہے اور جب جاتا ہے دوسروں کو رُلا دیتا ہے۔ اگر کوئی بچہ وقتِ ولادت نہ روئے تو اس کی زندگی مشکوک ہوتی ہے۔ پس " رونا " دلیلِ حیات ہے۔ اسی طرح انسان کی موت پر اگر کوئی آنسو بہانے والا نہ ہو تو لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ اس کا وارث موجود نہیں ہے۔

رونا ایک ایسا فطرتی عمل ہے کہ جس سے ملحد و دہریئے بھی انکار نہیں کر سکے۔ انہوں نے وجود خداوندی کا انکار تو کر دیا لیکن جب بھی کوئی مادہ پرست اس جہان سے رخصت ہوتا ہے تو اس کا سوگ انتہائی خلوص سے منایا جاتا ہے۔ سٹالن، ماؤزے تنگ اور چراین لائی کی مثالیں آپ حضرات کے سامنے ہیں۔ ماضی قریب میں چین کے انقلابی لیڈر آنجہانی ماؤزے تنگ کا انتقال ہوا۔ اہلِ چین اور دیگر ممالک میں جس طریقے سے ان کا سوگ منایا گیا ہے وہ آپ حضرات کے سامنے ہے۔ اگر ایسا کرنا معیوب ہوتا یا بے صبری و بزدلی کا باعث ہوتا تو ایسی انقلابی قوم اس فعل کا ارتکاب نہ کرتی۔

(۸) رونا ایک ایسا معقول فعل ہے جو کسی کو کسی برائی میں نہیں ڈالتا۔ بلکہ رونے سے دوسروں کے دلوں میں ہمدردی پیدا ہوتی ہے۔ اور رونے والا دوسروں کا دلاسہ حاصل کرنے کا فائدہ اٹھاتا ہے۔ کیوں کہ فطرتاً یہ سمجھا جاتا ہے کہ رونا ہمیشہ وہی ہے جسے ناسازگار حالات یا واقعاتِ غم کا سامنا ہو چونکہ رونا اختیاری فعل نہیں ہے۔ لہٰذا جس فعل میں انسان لاچار و مجبور ہو وہ ناجائز کیسے ہو سکتا ہے۔؟

مندرجہ بالا سطور سے اس بات پر واضح روشنی ملائی گئی کہ فطرت و عقل
کے مطابق رونا معیوب قرار نہیں پا سکتا۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ رونے سے
تعصب برتا جائے بلکہ جو لوگ دوسروں کو رونے سے منع کرتے ہیں
زندگی میں کئی بار خود روئے ہیں۔

یاد رکھیئے بُری بات وہی ہوتی ہے جس کا نتیجہ بُرا ہو یا محرک
فعل کا انحصار نیتِ بد پر ہو۔ اگر اس کام کا نتیجہ بُرا نہیں اور نیت بھی
نیک ہے تو اسے بُرا کہنا بُری بات ہے۔ ہم ناظرین کو دعوتِ فکر دیتے
ہیں کہ اگر رونا بُرا ہے تو اس سے پیدا شدہ کوئی نتیجہ ایسا بتائیے جو اچھا
نہ ہو۔ اگر قاصر رہیں تو رونے کی مذمت نہ کریں۔

(۹) "رونا" انسانی حیات سے اس قدر منضبط ہے کہ انتہائی خوشی و
مسرت کے مواقع پر بھی غالب آ جاتا ہے اور آنکھیں اشکبار ہوئے بغیر
نہیں رہتی ہیں ایسے رونے کو ہم لوگ خوشی کے آنسو کہتے ہیں۔

(۱۰) بعض حضرات "رونا" فطری امر تسلیم کرتے ہیں لیکن معترض ہیں
کہ ہر وقت کا رونا عین غیر فطری ہے۔ جو کوئی ہر وقت روتا ہے انسانی فطرت
اس سے نفرت پر مجبور کرتی ہے۔ ایسے معترضین کی دلیل ہے کہ جو بچہ ہر
ہر وقت بلاوجہ روتا ہے اس سے اس کے والدین تنگ آ جاتے ہیں۔
اور جو زوجہ ہر وقت رونی صورت بنائے رہے اس کا شوہر اسے وبال
سمجھتا ہے۔

مگر یہ اعتراض از خود غیر فطری ہے کیوں کہ جب فعل ہی فطری ہے

تو پھر وہ کسی صورت میں بھی غیر فطری طور پر سرزد نہیں ہو سکتا کیوں کہ
ایسا امر محال عقلی ہے۔ اگر بچہ روئے گا تو یقیناً اس کی کوئی ضد ہوگی یا
خواہش یا پھر اسے کوئی تکلیف ہوگی۔ اگر اس کی ضد یا خواہش پوری
کر دی جائے گی تو پھر وہ بچہ رونا بند کر دے گا۔ اسی طرح جب اس کی تکلیف
کا مناسب علاج کر دیا جائے گا تو وہ چپ ہو جائے گا۔

بیوی اگر رونی صورت بنائے گی تو اس کی بھی جائز رونا جائز وجہ
ضرور ہوگی۔ ورنہ بصورت دیگر ایسا رونا ٹسوے بہانا ہوگا۔ ریاکاری و
مکاری ہوگی جو کہ غیر فطری ہے اور جب کوئی بھی مستحسن فعل حدِ اعتدال
سے تجاوز کر جائے گا تو وہ مذموم ہوگا۔ حتیٰ کہ اگر نماز بھی ریاکاری سے
پڑھی جائے گی تو قابلِ تعریف نہ ہوگی۔ پس معلوم ہوا کہ بدنیتی اور
ریاکاری سے کوئی بھی کام کیا جائے گا تو اس کا فاعل قابلِ مذمت ہوگا
لیکن فعل حدِ عدل میں ہوتے ہوئے قابلِ مذمت قرار نہیں دیا جا سکتا۔

پس مندرجہ بالا دس دلائل اور کئی دیگر اثبات سے ثابت ہوا کہ
رونا عین فطری امر ہے اور کسی لحاظ سے بھی عقل و دانش کے خلاف
نہیں ہے۔

ماتم بنظرِ فطرت و شعور

اب رہا یہ سوال کہ سینہ زنی اور سر پیٹنا عقلی لحاظ سے کہاں تک
درست ہے؟ اس کا جواب ہم یوں عرض کرتے ہیں کہ مشاہدہ گواہ ہے

ہر ایک فعل کے چند معاونین افعال ہوتے ہیں۔ جنہیں اگر ضروریات فعل سے تعبیر کیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ مثلاً انسان کھانا کھاتا ہے۔ اس کا ایک فعل "کھانا" بہت سے معاون افعال کے بعد وجود میں آئے گا یعنی ہاتھ دھونا، دستر خوان پر بیٹھنا، ہاتھوں سے کھانا اور برتن درست کرنا۔ منہ میں نوالہ ڈالنا۔ دانتوں سے چبانا وغیرہ۔ یعنی ان سب افعال کا مجموعہ فعل ہوا "کھانا"۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ معاونین افعال اصل فعل کی ضروریات یا اس کے تقاضے ہیں۔

اسی طرح ہنسنا لیجئے۔ اس میں مسکرانا، قہقہہ لگانا، منہ کھول کر یا بند کر کے ہنسنا۔ یہ سب کیفیات صرف منہ کی ہیں۔ اس لئے علاوہ بسا اوقات انسان ہنستے ہنستے چکر کاٹتے ہیں۔ اور جوں جوں ہنسنے کی مقدار میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے توں توں انسان کی کیفیت حرکات تبدیل ہوتی جاتی ہیں۔ اور اصل فعل کی ضروریات یا تقاضوں میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے بعینہٖ ہر فعل پر تحقیقی نظر ڈالئے تو اس کی مختلف ضروریات ظاہر ہوں گی اور اس کے مختلف تقاضے معلوم ہوں گے۔ مغموم حالت میں پہلے انسان چپ ہوتا ہے پھر خاموشی سے روتا ہے آہیں بھرتا ہے ہچکیاں لیتا ہے اور جس طرح ہنستے وقت لیٹتا اور چکر کاٹتا ہے اسی طرح روتے وقت اس کے جذباتِ غم فطری طور پر بے بس کر دیتے ہیں کہ وہ جسم کے کسی حصے کو پیٹ لیتا ہے یا سینہ زنی کر لیتا ہے تو یہ اس کی محبت کا تقاضا یا شدتِ احساسِ غم کا نتیجہ قرار پاتا ہے۔

آپ نے شاید مشاہدہ فرمایا ہوگا کہ جب کبھی کسی کوے یا چڑیا کا بچہ

اپنے گھونسلے سے باہر آ جاتا ہے تو اس کے ماں باپ اس کے غم میں زور زور سے شور مچاتے ہیں اپنے بازوؤں کو کھولتے اور بند کرتے ہیں، حالتِ اضطراب میں ادہر اُدہر پھدکتے ہیں۔ اور ان تمام حرکات سے ان کی مغموم کیفیت قلبی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

آپ اپنی روزمرّہ زندگی میں جب کسی المناک واقعہ کو بیان کرتے ہیں تو اکثر بے ساختہ اُف کہہ کر اپنے جسم کا کوئی حصہ پیٹ لیتے ہیں جس سے ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے کہ یہ بات بڑی المناک ہے۔

لہٰذا پیٹنا نہ تو فطرت کے خلاف ہے اور نہ ہی دیوانہ پن۔ اس سے معاشرے اور انسانیت پر کوئی برا اثر نہیں پڑتا۔ اور جس فعل کا نتیجہ برا نہ ہو وہ فعل کبھی معیوب قرار نہیں پا سکتا۔ اگر میں یہ کہوں کہ جب بھی کسی گھر میں کوئی موت ہوتی ہے تو کہرام پڑ جاتا ہے۔ نہ صرف بچے اور عورتیں بلکہ مرد بھی میّت پر روتے ہیں یہاں تک کہ شدید غم سے مجبور ہو کر ٹکریں مارتے ہیں اور یہ فعل ان سے فطری طور پر سرزد ہوتا ہے صدمہ اس قدر ان کے دلوں پر اثر انداز ہوتا ہے کہ وہ روئے پیٹے بغیر نہیں رہ سکتے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا انکار محض ہٹ دھرمی کے سوا کچھ نہیں۔ اگر عام لوگوں کی صفِ ماتم میں پیٹنا خلافِ فطرت نہیں بلکہ شدید اضطراب کا نتیجہ ہے تو ماتم حسینؑ کو نشانۂ اعتراض کیوں بنایا جاتا ہے۔ کسی عزادار گھر کے اہل و عیال کو رونے پیٹنے سے روکنے کی کوشش ہمیشہ تشنۂ کامیابی اسی لئے رہتی

ہیں کہ رونا پیٹنا فطری افعال ہیں جو شدتِ احساس کا قدرتی نتیجہ اور انتہائی غم کا تقاضہ ہیں۔

گریہ وزاری اور آہ وفغاں کی فطری حیثیت

عقل کہتی ہے کہ خوشی کے موقع پر خوشی مناؤ غم میں غم۔ جس طرح خوشی کی مختلف رسومات ہیں، جشن کرنا، جلسہ بلوانا، دعوت کرنا، سجاوٹ کرنا، مدح وستائش اور قصائد پڑھنا، تحفے پیش کرنا اور چراغاں کرنا وغیرہ، موقع کی اہمیت کے مطابق کم یا زیادہ اسی طرح غم و درد کی ضروریات ہیں۔ رونا، پیٹنا، آہ و فریاد اور نوحہ خوانی و بین کرنا۔ جب خوشی کی رسموں کو عقلمندی قرار دیا جاتا ہے تو یہ بڑی بے انصافی ہے کہ غم کی ضروریات کو بعید از عقل کہا جائے۔ انسانی زندگی میں غم و خوشی دونوں اہم ہیں اگر خوشی کی رسومات بڑھ چڑھ کر منائی جا سکتی ہیں تو غم کی ضروریات بھی اپنے وقت پر اپنائی جا سکتی ہیں۔

اور یہ واقعہ کی اہمیت کے مطابق محض گریہ سے بڑھ کر ماتم تک بھی پہنچ سکتی ہیں۔

مشاہدہ گواہ ہے کہ بوقت غم و حزن و تکلیف بے زبان جانور تک اظہارِ غم آہ وفغاں سے کرتے ہیں۔ اگر کسی پرندہ کا کوئی بچہ گھونسلے سے گر جائے تو آپ نے ملاحظہ کیا ہوگا کہ اس کے والدین اس کے غم میں

کس قدر شور و غوغا کرتے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ غم کے موقع پر جزع و فزع اور آہ و بکا کرنا غیر فطری فعل نہیں ہے۔

المختصر عزاداری عین مطابق عقل و فطرت ہے جس کا سب سے بڑا گواہ مشاہدہ ہے۔ جو حضرات اسے عقل کے خلاف کہتے ہیں ان سے درخواست ہے کہ ایسی دلیل دیں جو عقل و فطرت کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے یہ ثابت کر دے کہ عزاداری انسانیت اور اسلام کے لئے مضر ہے۔ اگر کوئی ایسا ثبوت نہیں تو بے ضرر فعل کی مذمت کرنا چہ معنی دارد؟

اثبات از کتب اہلسنۃ والجماعۃ

گذشتہ اوراق میں صرف عقل اور فطرت کے پہلو کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک اجمالی خاکہ پیش کیا گیا کہ رونا پیٹنا اور واویلا عقل کے خلاف نہیں ہیں۔ اب ہم سنتِ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ دکھاتے ہیں کہ غمِ حسینؑ میں ہمارا رونا پیٹنا مطابق سنتِ رسولؐ ہے یا برعکس؟

میں یہ دعویٰ کرتا ہوں کہ عزاداری امام حسینؑ سنتِ نبویؐ بھی ہے اور سنتِ ائمہؑ بھی۔ اس سے آگے یہ کہ سنتِ قولی بھی ہے اور سنتِ فعلی بھی۔ میرے اس دعوے کا ثبوت حسب ذیل احادیث ہیں۔ جو اہل سنۃ والجماعۃ کی معتبر کتابوں سے پیش کی جا رہی ہیں:-

۱۔ منتخب کنز العمال برحاشیہ مسند احمد بن حنبل میں ایک طویل حدیث رقم کی گئی ہے جو امیر المومنین علیؑ ابن ابی طالبؑ سے مروی ہے کہ:۔

قال دخلت علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم ذات یوم وعیناہ تفیضان قلت یا نبی اللہ اغضبك احد ما شان عینك تفیضان قال بل قام من عندی جبرئیل قبل فحدثنی ان الحسین یقتل بشط الفرات فقال هل لك ان اشمك من تربته قلت نعم فمد یدہ فقبض قبضة من تراب فاعطانیها فلم املك عینی ان فاضتا۔

(روایت اہلسنت، منتخب کنز العمال برحاشیہ مسند احمد بن حنبل جلد ۵ صفحہ ۱۱۲ مطبوعہ مصر)

ترجمہ:۔ حضرت علیؑ نے فرمایا میں ایک روز حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور آپؐ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ میں نے کہا یا نبیؐ کیا آپؐ کو کسی نے ناراض کیا ہے؟ آپ کی آنکھوں سے آنسو کیوں جاری ہیں؟ رسول خدا نے فرمایا بات یہ ہے کہ جبرئیل ابھی میرے پاس سے اٹھے پس انہوں نے مجھ سے بیان کیا کہ حسینؑ فرات پر قتل کیا جائے گا۔ پھر جبرئیل نے کہا اگر آپ چاہتے ہیں تو میں آپ کو وہاں کی خاک سنگھاؤں؟ میں نے کہا "ہاں"۔ پس جبرئیل نے ہاتھ بڑھایا اور ایک مٹھی خاک مجھے دی پس میری آنکھیں ایسی تو نہ تھیں جو نہ روتیں؟

روایت بالا کو اہل سنت کے ایک اور امام شعبی نے بھی بیان کیا ہے۔ قابل غور امر ہے کہ حسینؑ زندہ ہیں اور رسولؐ رو رہے ہیں زندہ پر رونا سنت ہوا یا نہیں؟ اس قسم کی کئی روایتیں کتب اہل سنت میں موجود ہیں کہ غم حسینؑ میں رسول اللہؐ روتے رہے اور غمگین رہے۔ اگر آپ سانحہ کربلا کے بعد تک رہتے تو کیا حضورؐ نہ روتے جبکہ شہادت حسینؑ سے قبل اشکبار رہے؟

۲۔ عن ام الفضل بنت الحرث فدخلت یوما علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فوضعته فی حجرہ ثم کانت منی القفاقة فاذا عینا رسول اللہ یهریقان الدموع قالت فقلت یا نبی اللہ بابی انت وامی ما لك قال اتانی جبرئیل علیہ السلام فاخبرنی ان امتی ستقتل ابنی هذا فقلت هذا قال نعم واتانی بتربة من تربته حمراء۔ (روایت اہلسنت)

(مشکوٰۃ باب مناقب اہلبیت، اردو ترجمہ مشکوٰۃ جلد ۳ صفحہ ۲۴۴ حدیث نمبر ۵۸۸۸ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع کراچی)

ترجمہ:۔ ام الفضلؓ (رسول اللہؐ کی چچی، حضرت عباسؓ کی زوجہ) کا بیان ہے کہ پس ایک روز میں رسولؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور حسینؑ کو رسولؐ کی گود میں دے دیا۔ پس میں ذرا سی دیر کے لئے دوسری طرف متوجہ ہو گئی۔

اس کے بعد دیکھا کہ رسول صلعم کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں
میرے دریافت کرنے پر ارشاد فرمایا کہ جبرئیل میرے پاس آئے اور
مجھے خبر دی کہ میری اُمّت میرے اس فرزند کو قتل کرے گی۔ میں نے
پوچھا اس فرزند کو؟ فرمایا ہاں اور مجھے اس کے مرقد کی سُرخ
خاک دی۔

(مندرجہ بالا روایات کا تعلق غم حسین ع سے ہے لیکن یہ بات
بھی کتب اہل سُنّت سے پوری طرح ثابت ہے کہ امام حسین علیہ السلام
کے علاوہ نبی کریم ص دیگر محبوب ہستیوں کے لئے بھی روئے مثلاً)

رسُول کریم ص اور صحابہ کا حضرت آمنہ ع کی قبر پر رونا

صحیح مسلم جلد ۱ صفحہ ۶۰۵ حدیث ۱۰۹۰، ۱۰۹۲ میں حضرت ابوہریرہ ؓ
سے مروی ہے کہ :۔

قال زار النبی صلی اللہ علیہ وسلم قبر اُمّہ فبکی
وابکی من حولہ فقال صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم
استاذنت ربی فی ان استغفر لھا فلم یوذن
لی واستاذنتہ فی ان ازور قبرھا فاذن لی۔

ترجمہ :۔ رسول مقبول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اپنی
والدہ کی قبر کی زیارت کی تو آپ روئے اور جو آپ ص کے ساتھ تھے
(یعنی صحابی) وہ بھی روئے تو رسول اللہ ص نے فرمایا "میں نے اللہ سے

اپنی والدہ کی مغفرت[1] طلب کی تھی لیکن خدا نے مجھے اس کی اجازت نہیں
دی۔ پھر میں نے اپنی ماں کی قبر کی زیارت کے لئے اجازت چاہی تو وہ
اجازت مجھے اللہ نے دے دی۔

عام الحزن (غم کا سال) دلیلِ عزاداری ہے

بعثت کے دسویں سال اسلام اور پیغمبر اسلام کے دو عظیم محسن
اس دارِ فانی سے جنت نعیم کی طرف کوچ کر گئے۔ اس صدمہ کا اثر
جو رسول مقبول ص کے دل پر ہوا اس کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا
ہے۔ کہ حضرت ابو طالب ع اور ام المومنین خدیجۃ الکبریٰ ع کی وفات کے
باعث رسول ص کو مکہ چھوڑنا پڑا اور اس سال کو آج تک مسلمان "غم کا
سال" کہتے ہیں۔ اگر غم منانا یعنی سوگ کرنا معیوب ہے تو پھر اس
"عام الحزن" کے بارے میں کیا ارشاد ہے؟ ذرا ہمیں بھی سمجھا دیا جائے۔

سُنّتِ ائمہ ع

ہم نے جناب رسالت مآب ص کی سنت قولی و فعلی
دونوں صورتوں سے "رونا" سنت ثابت کیا ہے
اب ذرا ابو الائمہ حضرت امیر المومنین علی ع ابن ابیطالب کے مندرجہ ذیل
شعروں پر توجہ فرمائیے تاکہ رونا سنتِ ائمہ ع بھی ثابت ہو جائے۔ جب

---

[1] یہ بات شیعہ عقیدہ کے خلاف ہے کیونکہ ہم پیغمبر ص و حجتِ خدا کے
والدین کو مومن سمجھتے ہیں۔

امام اوّل کی سنت ثابت ہوگی تو باقی ائمہؑ کی تصدیق خود بخود ہی ہو جاۓ گی چنانچہ "دیوانِ علیؑ" ص۱۲۹ پر حضرت علیؑ فرماتے ہیں۔

اعینی جودا بارک اللہ فیکما
علی ھالکین لا تری لھما مثلا
علی سید البطحا وابن رئیسھا
وسیدۃ النسوان اوّل من صلّٰی

ترجمہ:۔ اے میری دونوں آنکھوں خدا تم میں برکت دے خوب روؤ ان مرنے والوں پر جن کا مثل اور کوئی نہیں کہ مکہ کے سردار اور اس کے رئیس کے بیٹے پر اور عورتوں کی سردار پر کہ جس نے سب سے پہلے نماز پڑھی۔

مولائے کائناتؑ نے حضرت ابو طالبؑ اور بی بی خدیجہؓ کی وفات کے غم میں یہ نوحہ خوانی فرمائی۔ اگر رونا اور غم منانا مذموم ہوتا تو حضرت علیؑ ایسا کبھی نہ کرتے۔

علامہ اہلسنت ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں "حضرت اُمِ رباب زوجہ امام حسینؑ ایک سال تک روتی رہیں۔" اصابہ ج۸ ص۲۲۸ مطبوعہ کلکتہ

گریہ اور بَین کرنا

اثبات از کتب اہل سنت

عن انس قال دخلنا مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

وابراھیم یجود بنفسہ فجعلت عینا رسول صلی اللہ علیہ وسلم تذرفان فقال لہ عبدالرحمٰن بن عوف وانت یا رسول فقال ان العین تدمع والقلب یحزن ولا نقول الا ما یرضی ربنا وانا بفراقک یا ابراھیم محزونون۔

(روایت اہلسنت مشکوٰۃ المصابیح' باب البکا علی المیت' اردو ترجمہ مشکوٰۃ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع کراچی جلد ۱ ص۲۹۸۔

حدیث ۱۶۱۸)

ترجمہ:۔ (ابراہیم فرزند رسولؐ کی وفات کے سلسلے میں حالات بیان کرتے ہوئے) انس بن مالکؓ کہتے ہیں کہ ہم لوگ رسول اللہ صلعم کے ساتھ مکان میں داخل ہوئے اور ابراہیم دم توڑ رہے تھے۔ پس رسول خداؐ کی دونوں آنکھوں سے اشک جاری ہوئے۔ عبدالرحمٰن بن عوف نے کہا یا رسول اللہؐ آپ روتے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا اے عوف کے بیٹے! یہ تو رحمت ہے جس کے بعد گریہ بھی ہو جاتی ہے۔ پھر ارشاد ہوا کہ آنکھ روتی ہے دل غمگین ہوتا ہے مگر ہم اللہ کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کہتے (یعنی اللہ تعالیٰ سے شکوہ نہیں کرتے)

اے ابراہیم! بے شک ہم تیری جدائی سے غمگین اور محزون ہیں۔

اس حدیث نے یہ ثابت کر دیا کہ سرکار ارض و سماؐ نے گریہ وزاری کی اجازت دے دی ہے اور منع نہیں فرمایا ہے بلکہ خود رسولِ خداؐ نے

پر بین کیا۔

" اے ابراہیم! بے شک ہم تیری جدائی سے غمگین اور محزون ہیں۔"

وفات ابوطالبؑ پر آنحضرتؐ کا آہ و بکا کرنا

کتب اہلسنت میں مرقوم ہے کہ وفاتِ حضرت ابوطالبؑ پر آنحضرتؐ اپنے شفیق و مربی چچا کے جنازہ کے ہمراہ تشریف لے گئے اور آپؐ نے فرمایا:۔

" وقال وصلتک رحمہ وجزیت خیرا یا عم "

" اے چچا! آپ نے صلۂ رحمی ادا کر دیا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔"

(سیرت حلبیہ جلد ۱ صفحہ ۳۷۳ روایت اہلسنت)

نیز دیکھیے تاریخ الخمیس علامہ حسین دیار بکری اہلسنت جلد ۱ صفحہ ۳۰۱

شاہ عبدالحق محدث دہلوی اسی روایت کو اس طرح لکھتے ہیں:۔

" و نیز آوردہ کہ سید عالمؐ ہمراہ جنازہ ابوطالبؑ و میرفت و میگفت اے عم من اصلہ رحم بجا آوردی و در حق من تقصیر نہ کردی خدائے تعالیٰ ترا جزائے خیر دہاد۔"

(مدارج النبوۃ جلد ۲ صفحہ ۶۹)

یعنی اے چچا آپ صلہ رحم بجا لائے اور میرے حق میں آپ نے کوئی غلطی نہیں کی۔ اللہ آپ کو جزائے خیر دے۔

(مگر افسوس ہے کہ رسول کریمؐ نے جس محسن کے بارے میں ایسے الفاظ ارشاد فرمائے مسلمان اسی کے ایمان پر شبہ کرتے ہیں۔)

اثباتِ ماتم از کتبِ سنیہ

"عن سعید بن مسیب انه قال جاء اعرابی الی رسول اللہ یضرب نحرہ وینتف شعرہ یقول ھلک الابعد فقال له رسول اللہ وما ذاک قال اصبت اھلی وانا صائم فی رمضان فقال له رسول اللہ ھل تستطیع ان تعتق رقبة قال لا قال فھل تستطیع ان تھدی بدنة قال لا قال فاجلس فاتی رسول اللہ بعرق من تمر فقال خذ ھذا فتصدق به فقال ما احد احوج منی یا رسول اللہ فقال کله وصم یوما مکان ما اصبت"

(روایت اہلسنت 'موطا' مترجم مولوی وحید الزمان صفحہ ۲۵، موطا امام مالک باب کفارہ من افطر فی رمضان صفحہ ۹ سطر آخری مطبوعہ مجتبائی پریس۔ نیز دیکھیے اردو ترجمہ از وحید الزماں شائع کردہ ولی محمد اینڈ سنز پاکستان چوک کراچی کتاب الصیام باب "جان بوجھ کر روزہ توڑنے کا کفارہ" صفحہ ۱۴۰ احادیث ۶۰۳ وغیرہ)

ترجمہ:۔ سعید بن مسیب نے کہا کہ ایک دیہاتی حضورؐ کے پاس سینہ پیٹتا ہوا اور بال اکھاڑتا ہوا آیا۔ کہہ رہا تھا کہ نیکیوں سے دور رہنے والا ہلاک ہو گیا۔ آپ نے اس سے پوچھا کیا ہوا۔ کہنے لگا میں نے اپنی بیوی سے رمضان میں روزے سے صحبت کر لی۔ فرمایا کیا ایک غلام آزاد کر سکتے ہو۔ کہنے لگا نہیں۔ فرمایا، ایک اونٹ یا ایک گائے قربانی

کے لئے حرم بھیج سکتے ہو۔ (یہ جملہ محدثین کے نزدیک غلط ہے۔ صحیح یہ ہے کہ دو مہینے کے مسلسل روزے رکھ سکتے ہو) کہنے لگا "نہیں"۔ فرمایا "بیٹھو"۔ اتنے میں آپ کے پاس کھجوروں کا ایک ٹوکرا آیا۔ فرمایا" اسے لے لو اور صدقہ کرو" کہنے لگا" اے اللہ کے رسولؐ مجھ سے زیادہ کوئی حاجت مند نہیں"۔ فرمایا" تم ہی کھالو اور روزے کی قضا کر لو"۔

منقولہ روایت سے ماتم کرنا حدیثِ تقریری سے جائز ثابت ہوا کیونکہ دیہاتی مسلمان جو کہ صحابی ہے سینہ پیٹتا ہوا اور بال نوچتا ہوا حاضرِ خدمتِ رسولؐ ہوا لیکن حضورؐ نے اسے اس فعل سے منع نہ فرمایا۔ واضح ہوا کہ صحابی محض ایک روزہ کے ٹوٹ جانے کے غم سے غمزدہ تھا اور اس نے سینہ پیٹا یعنی ماتم کیا تھا لہٰذا معلوم ہوا کہ حالاتِ غم میں ماتم عمل مقدوح نہیں ہے۔ پھر یہ کہ اس ماتمی پر رسول مقبولؐ نے کوئی اعتراض نہ کیا بلکہ ہمدردی فرمائی۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ ماتم داروں سے ہمدردی سنتِ رسولؐ ہے۔

مؤذنِ رسولؐ حضرت بلالؓ کا ماتم کرنا

شیخ عبدالحق محدث دہلوی اپنی کتاب مدارج النبوۃ جلد ۲ ص ۵۴۴ پر لکھتے ہیں کہ:۔

"پس بیروں آمد بلال دست بر سر زناں و فریاد کناں"

یعنی حضرت بلال رضی اللہ عنہ سر پیٹتے اور فریاد کرتے ہوئے باہر تشریف لائے۔

یہ واقعہ اس طرح ہے کہ حضرت بلالؓ حضورؐ کے مرض الموت کے

زمانہ میں حضورؐ کے پاس نماز کے لئے اندر تشریف لے گئے اور جب ان کو معلوم ہوا کہ آپؐ نماز نہیں پڑھائیں گے تو محبتِ رسولؐ میں حضورؐ کی تکلیف کے احساس و غم میں یہ جلیل القدر صحابی رسولؐ سر پیٹتے ہوئے حجرہ سے باہر آئے۔ واضح ہو کہ حضورؐ ظاہراً زندہ بھی ہیں اور بلالؓ ماتم و فریاد کر رہے ہیں مگر کوئی صحابی حضرت بلالؓ کو اس فعل سے منع نہیں کرتا ہے۔ لہٰذا ماننا پڑے گا کہ غم و سوگ کی حالت میں ماتم اصحاب رسولؐ کے نزدیک جائز تھا"۔

تکمیلِ شریعت کے بعد ماتم

قالت ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبض وھو فی حجری ثم وضعت راسہ علی وسادۃ وقمت التدم مع النساء واضرب وجھی ؎۱

(روایت اہلسنت مسند امام احمد بن حنبل مطبوعہ المیمنہ جلد ۶ ص ۲۷۴)

امام اہلسنت احمد حنبل حضرت اُم المومنین عائشہؓ کے متعلق تحریر کرتے ہیں" یعنی (حضرت عائشہ) نے بیان کیا کہ رسولؐ خدا نے وفات پائی تو میں نے حضورؐ کا سر تکیہ پر رکھ دیا۔ میں عورتوں کے ساتھ کھڑی ہو

؎۱ علامہ حافظ جلال الدین سیوطی نے تفسیر درِ منثور میں بی بی عائشہؓ کا حضرت ابوبکر کے لئے ماتم کرنا لکھا ہے۔

گئی اور میں نے اپنا منہ پیٹا۔

شریعت عہدِ رسالت میں مکمل ہو چکی تھی لہٰذا بی بی عائشہؓ نے تکمیلِ شریعت کے بعد ماتم کیا۔ پس ثابت ہوا کہ آنحضرتؐ نے ماتم کو حرام قرار نہیں دیا تھا۔

حضرت عثمان پر انکی بیویوں نے ماتم کیا

علامہ اہلسنت عبدالحمید بن الحدید کی شرح نہج البلاغہ جلد ۲ صفحہ ۹۷ میں ہے کہ حضرت عثمان کے قتل کے بعد ان کی بیویوں نے آہ و فریاد کی اور منہ پیٹنے لگیں۔

صحابی خالد بن ولید کا ماتم

لقد بکی علی خالد بن ولید بمکہ والمدینۃ النساء السنبی المغیرہ سبعا لیشقق الجیوب ولیضربن الوجوہ۔

(روایت اہلسنت کنز العمال جلد ۸ صفحہ ۱۱۹ ملا متقی حسام الدین)

ترجمہ:- خالد بن ولید پر بنی مغیرہ کی عورتیں سات یوم تک مکہ اور مدینہ میں روتی رہیں اور انہوں نے گریبان پھاڑے اور منہ پیٹے۔

شہادت حسینؑ کے بعد آلِ رسولؐ کا ماتم

مشہور مورخ اہلسنت عمر ابو النصر اپنی کتاب "الحسین" میں لکھتے ہیں کہ آپ کی شہادت کا وقت آیا آپ کے اہل و عیال خیموں سے باہر

نکل کر جزع و فزع کرنے لگے۔

(کتاب الحسین باب "کوفہ کو روانگی" صفحہ ۱۸۸ ایڈیشن اول ترجمہ محمود پانی پتی)

امام احمد بن حنبل کی وفات پر ماتم

زمانہ متوکل عباسی میں اہل سنت نے اپنے امام احمد بن حنبل کی وفات پر ماتم کیا۔ حیوۃ الحیوان علامہ اہل سنت دمیری ذکر خلافت متوکل و تہذیب الاسماء علامہ نووی ملاحظ کیجیے۔ متوکل کو اہل سنت "محی السنۃ" یعنی سنت کو زندہ کرنے والا خلیفہ مانتے ہیں۔ اسی متوکل نے حکم دیا کہ جس جگہ امام احمد بن حنبل کی نماز جنازہ پڑھی گئی تھی وہاں ماتم کیا جائے یہاں تک کہ پچیس ۲۵ لاکھ آدمیوں نے وہاں ماتم کیا۔

ظاہر ہے کہ ان تصریحات کے بعد عزاداری کو ناجائز سمجھنا درست قرار نہیں پا سکتا۔

اہل مدینہ جس طرح جلوس کی صورت میں قافلۂ سادات تک پہنچے اس پر بھی غور فرمائیے۔

عمر ابو النصر لکھتے ہیں کہ جب حضرت حسینؑ آپ کے ساتھیوں اور اہلبیتؑ کی شہادت کی خبر مدینہ میں پہنچی تو لوگوں پر حزن و ملال کے بادل چھا گئے۔ عقیل ابن ابیطالب کی بیٹی دوسروں کے ہمراہ چیختی چلاتی ہوئیں باہر نکل آئیں اور ان کی زبان پر یہ شعر جاری تھے۔

ترجمہ۔ تم کیا کہو گے جب قیامت میں رسول اللہ صلعم تم سے پوچھیں گے کہ اے لوگو جو آخری امت ہو۔ تم نے میرے اہلبیتؑ اور اولاد کے ساتھ میری وفات کے بعد کیا سلوک کیا؟ ان میں سے بعض کو قیدی بنالیا اور بعض خاک و خون میں غلطاں پڑے ہیں کیا میرے احسانات کا یہی بدلہ تھا جو تم نے میرے عزیزوں اور رشتہ داروں کے ساتھ سلوک کرکے ادا کیا؟

اب ہر عقلمند اور انصاف پسند انسان فیصلہ کر سکتا ہے کہ حقیقت کیا ہے۔ اور غیر حقیقت کیا۔ مندرجہ بالا حوالہ جات کھلی دلیل ہیں کہ غم حسینؑ میں ماتم کرنا، بین کرنا اور رونا جائز ہے۔ اگر رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کربلا کے حادثہ تک یا اس کے بعد زندہ[1] رہتے، تو یقیناً ہم سے بڑھ کر عزائے حسینؑ برپا کرتے جب کہ قبلِ شہادت امام حسینؑ بے چین، اغم گین اور اشک بار رہے۔

مرثیہ خوانی اور حضرت عمر

حضرت عمر بن خطاب کے متعلق مولوی شبلی نعمانی "الفاروق" میں لکھتے ہیں کہ عرب کا مشہور مرثیہ گو متمم بن نویرہ ان کی خدمت میں آیا تو انہوں نے فرمائش کی کہ زید (پسر عمر بن خطاب) کا مرثیہ کہو۔ مجھ کو تمہارا سا کہنا آتا تو میں خود کہتا۔

پس ثابت ہوا کہ اہل سنت کے خلیفہ دوم مرثیہ خوانی کو جائز سمجھتے تھے۔

---

[1] یہاں دنیوی ظاہری حیات مراد ہے ہمارا ایمان ہے کہ حضورؐ اب بھی زندہ ہیں اور وہ حیات خاص ہے۔

حضرت شیخ عبدالقادر بغدادی کا قول

قبر حسینؑ پر اللہ تعالیٰ نے ستر ہزار فرشتے مقرر کئے ہیں جو قیامت تک قبر حسینؑ پر روتے رہیں گے۔ (غنیۃ الطالبین)

اہل سنت کے پیران پیر کے اس قول سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ فرشتے ایک معصوم مخلوق ہیں۔ اگر گریہ و بکا وغیرہ معیوب ہوتے تو اللہ اس نوری مخلوق کو قبر حسینؑ پر اس فعل کے لئے کبھی مقرر نہ کرتا۔

قرآن مجید اور عزاداری

تمام دنیا کے اہلِ عقل اس بات پر عملاً متفق ہیں کہ قانون تعزیرات میں صرف ان ہی باتوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے جو ناجائز اور غیر قانونی ہوں۔ اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ ان باتوں کے علاوہ تمام چیزیں جائز ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کسی قانون کی کتاب میں یہ لکھا نہیں ملے گا کہ اجرت پر کسی سے کام لینا جائز ہے۔ لیکن یہ ضرور ہوگا کہ اگر کسی سے کوئی کام لے اور اجرت نہ دے تو یہ حرکت خلافِ قانون ہوگی۔ اس کے تدارک کی صورتیں لکھی ہوں گی۔ اور اس طریقہ بیان کی اصل وجہ یہ ہے کہ دنیا میں جائز چیزوں اور افعال کا شمار کرنا مشکل ہے نسبتاً خلاف قانون اور ناجائز باتوں کی تفصیل کے اس لئے قانون ان ہی باتوں کو بیان کرکے خاموش ہو جاتا ہے۔ اور اس کے علاوہ وہ سب کام اور

باتیں جائز اور قانونی سمجھی جاتی ہیں۔

چنانچہ ارشاد نبویؐ ہے کہ سب چیزیں جائز ہیں جب تک ان میں سے کسی پر ممانعت وارد نہ ہو۔ (متفق علیہ) ارشاداتِ رسالت مآبؐ سے صاف ظاہر ہے کہ اسی طریقہ پر اسلامی قوانین و اصول بھی مرتب کئے گئے ہیں۔ یعنی شریعتِ محمدیہ کی بنیاد اسی اصول پر رکھی گئی ہے کہ جس چیز کی ممانعت ظاہر نہ ہو وہ جائز ہے۔ لیکن بعض حضرات یہ اصول وضع فرما رہے ہیں کہ جس چیز کی اجازت بیان نہ ہوئی ہو وہ ناجائز ہے۔

عزاداری حسینؑ کو محض نئی چیز یا بدعت کہہ کر حرام قرار دینا واقعتہً غلط ہونے کے علاوہ اصول اسلام کے بالکل خلاف ہے۔ بلکہ یہ دیکھنا چاہیئے کہ عزاداری رضائے خداوندی اور منشائے الٰہی کے مطابق ہے یا نہیں؟ اس کے بعد اس کا فیصلہ کر کے عوام کو منع کرنا یا دعوت دینا صحیح طریق کار ہوگا ورنہ بغیر اس تحقیق کے بجز گمراہی کے کچھ نہ ملے گا۔ اگر بدعت ہر نئی چیز کو سمجھ لیا جائے تو فقہ اہلسنت کے موجودہ کئی قوانین و رواسم فہرستِ بدعات میں شامل کر لینے پڑتے ہیں۔ کعبہ کے چار مصلے "بدعت" ہوئے یا نہیں۔؟ ورنہ ثابت کریں کہ رسولؐ کے زمانہ میں تھے۔ قرآن تو یہ کہتا ہے کہ واتخذوا من مقام ابراھیم مصلی پھر یہ چار مصلے یعنی حنفی مصلا، شافعی مصلا، مالکی مصلا، حنبلی مصلا کیوں بنائے گئے؟ جبکہ نئی چیز کو بدعت کہتے ہیں تو یہ چار مصلے اہلسنت نے بنا کر عین مسجد الحرام میں "بدعت" کیوں جاری کی جب کہ قرآن کے واضح

حکم کے خلاف ابراہیمی مصلی چھوڑ کر یہ مصلے بنائے گئے۔

ہم نے عقلی بحث میں ثابت کیا ہے کہ رنج و الم اور خوشی و مسرت انسان کے طبعی و فطری افعال ہیں۔ جب قلب انسانی پر صدمہ پہنچتا ہے تو اس سے بخارات اُٹھتے ہیں۔ اور دماغ کی طرف چڑھتے ہیں۔ حرکت دل حد اعتدال سے زیادہ ہو جاتی ہے۔ اور انتظام قدرتی کے تحت وہ بخارات دماغ سے اتر کر آنکھوں کے راستے آنسو بن کر نکلتے ہیں۔ چونکہ یہ امر طبعی ہے لہٰذا خلافِ صبر نہیں ہے۔ کیونکہ اگر رونے کو خلافِ صبر مان لیا جائے تو معاذ اللہ خدا کو ظالم ماننا پڑیگا کیونکہ اگر خدا رونے پر پابندی عائد کرے جو کہ امر فطری ہے تو وہ طاقت سے زیادہ تکلیف دینا ہوگا۔ اور اس بات سے ذاتِ خداوندی پاک ہے اور ارفع ہے۔ رونے پر جبر کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کہ خدا کان اور قوتِ سماعت عطا کرنے کے بعد حکم دے کہ کوئی بات نہ سنو البتہ عمل کی شرط تو ہر جگہ قائم رہے گی۔ الغرض رونا عقلاً اور شرعاً کسی طرح بھی خلافِ صبر نہیں ہے۔ بلکہ از روئے قرآن بعض اوقات عبادت میں داخل ہے۔

ساری دنیا کے معترضین کو یہ کھلا چیلنج ہے کہ قرآن الحکیم سے عزاداری مظلوم کربلا ناجائز ثابت کریں تو میں اہل سنۃ والجماعۃ ہو جانے کو تیار ہوں ورنہ عزاء حسینؑ کو میں عین منشائے الٰہی ثابت کرتا ہوں۔ آیئے سب سے پہلے "رونا" قرآن کی رو سے دیکھتے ہیں۔

جوازِ گریہ از قرآن حکیم

قرآن میں جابجا موجود ہے کہ تمام انبیائے کرام مختلف موقعوں پر روئے، گڑگڑائے لیکن ذاتِ ایزدی نے ان کے اس فعل کو ناجائز قرار نہ دیا۔ قرآن مجید کھولئے اور تلاوت فرما کر غور کیجئے کہ آدمؑ، نوحؑ ایوبؑ، یحییٰؑ، ذکریاؑ، یونسؑ اور یعقوب جیسے جلیل القدر نبی روئے ـــ سورہ یوسف پڑھ لیجئے۔ خود سرکار دو عالمؐ، حضرت ابوبکر اور دیگر اصحابِ رسولؐ نے رونے کو پسند کیا۔ بلکہ ہم نے آج تک کبھی نہیں پڑھا کہ رسولِ اکرمؐ کبھی کھل کر ہنسے ہوں۔ لیکن رونے کے واقعات کئی نظر آئے ہیں۔ رونے کو ناجائز قرار دینے سے پہلے غارِ ثور میں کسی کا رونا ضرور ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ چنانچہ ارشادِ رب العزت ہے کہ

" وتضحکون ولا تبکون وانتم سامدون "

ترجمہ :۔ اور مضحکہ کرتے ہو اور نہیں روتے؟ اور تم غافل ہو۔ (سورۃ النجم)

اسی طرح ارشادِ خداوندی ہے کہ

" اذا تتلیٰ علیھم ایات الرحمٰن خروا سجدا و بکیا "(السجدۃ)

یعنی جب ان پر آیاتِ رحمان کی تلاوت کی جاتی ہے تو وہ روتے ہوئے سجدے میں گر پڑتے ہیں۔ (سورۃ مریم ۵۸)

اسی طرح سورۂ بنی اسرائیل میں ہے کہ

" ویخرون للاذقان یبکون ویزیدھم خشوعاً "

یعنی وہ ٹھوڑیوں کے بل گر پڑتے ہیں روتے ہیں۔ یہ (رونا) انہیں عاجزی میں بڑھاتا ہے۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ رونا نہ ہی خلافِ تہذیب ہے اور نہ ہی صبر کے منافی بلکہ عین عبادت ہے۔ اور انبیاء و صالحین کی صفاتِ خاصہ سے ہے۔

رونا دلیلِ شناختِ حق ہے

قرآن مجید پ۷ سورہ مائدہ ۸۳ ہے کہ " اور جب وہ اس کو سنتے ہیں جو کہ رسولؐ کی طرف نازل کیا گیا ہے۔ تو آپؐ ان کی آنکھوں سے آنسو بہتے ہوئے دیکھتے ہیں اس سبب سے کہ انہوں نے حق کو پہچان لیا۔ یوں کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہم ایمان لاتے ہوئے ہیں تو ہم کو بھی شاہدین کے ساتھیوں میں لکھ لے۔

آیت منقولہ اس امر کی دلیل ہے کہ رونا حق شناسی کی نشانی ہے اور ذاتِ احدیت کا پسندیدہ عمل ہے نہ کہ مذموم فعل ہے۔ اور خلافِ صبر ہے۔

غم و رنج کے موقع پر رونا جائز ہے

قرآن مجید پ۱۰ سورۃ التوبہ ۹۲ ہے کہ

" اور نہ ان لوگوں پر کوئی گناہ یا الزام ہے کہ جس وقت آپ کے پاس

اس واسطے آتے ہیں کہ آپؐ ان کو سواری دے دیں اور آپ کہہ دیتے
ہیں کہ میرے پاس کوئی چیز نہیں جس پر تم کو سوار کر دوں۔ وہ
اس حالت سے واپس چلے جاتے ہیں کہ ان کی آنکھوں سے آنسو رواں
ہو جاتے ہیں اس غم میں کہ افسوس ان کو خرچ کرنے کے لئے کچھ میسر نہیں۔"
آیت بالا سے ثابت ہے کہ غم یا افسوس کے اوقات میں رونا منع
نہیں بلکہ جائز و قابل تعریف ہے۔

صبر کیا ہے؟

مخالفین عزاداری سید الشہدا علیہ السلام عموماً حکم صبر کو عزاداری
کے خلاف بطور دلیل پیش کرتے ہیں۔ حالانکہ صبر کے وہ معنی نہیں ہیں جو
معترضین مراد لیتے ہیں بلکہ صبر کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے نفس کو ایسی
چیز کے اظہار سے روکے جو اس کے مناسب نہیں ہے اور فطری و
طبعی افعال سے روکنا صبر نہیں کہلاتا۔ ہم نے اوپر ثابت کیا ہے کہ غم و
رنج کے مواقع پر رونا فطری امر ہے اور مصیبت کے وقت نہ رونا اور
مظلوم کے ظلم سے متاثر نہ ہونا اور کسی دوست و محبوب کی مصیبت سے
متالم نہ ہونا قساوت قلب اور سنگدلی کہلاتا ہے جو نہایت ہی مذموم
ہے اور انسانیت سے انتہائی گرا ہوا درجہ رکھتا ہے لہٰذا ایسا معیوب
فعل کس طرح صبر کی فہرست میں جگہ پا سکتا ہے؟ پس چونکہ مخالفین
کا وضع کردہ مفہوم صبر نہ ہی مناسب ہے اور نہ ہی مستحسن لہٰذا عقلاً و

شرعاً دونوں اعتبار سے درست قرار نہیں پاتا ہے۔
چنانچہ قرآن مجید میں حضرت یعقوب علیہ السلام کا قصہ موجود
ہے کہ فراق پسر میں حزن و رنج سے ان کی آنکھیں سفید ہو گئیں۔ یعنی
اتنا کثرت سے روئے کہ ان کی بینائی جاتی رہی لیکن اس کثیر گریہ کے باوجود
خدا نے حضرت یعقوبؑ کو "صبر جمیل کرنے والا" فرمایا۔ پس معلوم ہوا
رونا خلاف صبر نہیں بلکہ عین صبر ہے۔
البتہ خدا کے خلاف شکوہ و شکایت کرنا بے صبری ہے۔ پس
چونکہ رونا قرآن مجید سے جائز و مستحسن ثابت ہوتا ہے اور صبر کے
خلاف نہیں ہے۔ لہٰذا جس قدر بھی روایات رونے کے خلاف پیش
کی جائیں گی خواہ وہ کسی مکتبِ فکر کی کتب سے ہوں، خلافِ فطرت
اور خلاف قرآن ہونے کی وجہ سے ناقابلِ اعتبار ہوں گی۔

اثباتِ ماتم از قرآن مجید

اب سب سے بڑا اعتراض جو ہے وہ ماتم کرنے کا ہے۔ آیئے
قرآن مجید سے دیکھیں کہ کسی نے اگر ایسا کیا ہو تو خدا نے روکا تو نہیں؟
اگر روکا ہے تو گناہ ہے اگر نہیں تو اجازت الٰہی میں شامل اور عمل
ثواب ہے۔ قرآن مجید کے چھبیسویں پارے کے آخری رکوع کی آیت
ملاحظہ فرمائیں۔

فاقبلت امراته فی صرة فصکت وجھھا ..... الخ
یعنی پس آئی بیوی ابراہیم کی چلاتی ہوئی اور اس نے اپنا منہ پیٹ لیا۔ (الذاریات ع۲۹)

"صکت" کے معنی

دیکھئے قاموس صکت کے معنی نیز ترجمہ شیخ الہند محمود الحسن و ترجمہ ڈپٹی نذیر احمد و ترجمہ شاہ رفیع الدین ملاحظہ کریں۔ واضح ہو کہ بی بی سارہؑ نے جو اپنا منہ پیٹا وہ محرومی اولاد کی وجہ سے تھا اور حیرت کی وجہ سے بھی تھا۔ پس جناب سیدالشہداؑ کا واقعہ زیادہ حیرت انگیز ہے کہ اگر بی بی سارہؑ اس وجہ سے حیران ہو کر پیٹتی ہیں کہ ہائے مجھ بانجھ کے ہاں لڑکا پیدا ہوگا تو یہ بات زیادہ حیرت انگیز ہے کہ امام حسینؑ کے نانا کا کلمہ پڑھنے والوں نے ہی حسینؑ کو شہید کر دیا۔ آخر یہ زیادہ حیرت انگیز کیوں نہیں جب کہ وفاتِ رسولؐ کو صرف پچاس برس ہی تو گذرے تھے؟

اگر پیٹنا ناجائز ہے تو نبی کی بیوی کو خدا نے یا نبی نے کیوں منع نہ فرمایا؟

یہ حضرت خلیل خدا کی بیوی تھیں جن کی سنتیں حج میں پوری کی جاتی ہیں۔ صفا و مروہ کے درمیان بھاگنا مادرِ اسمٰعیلؑ کی سنّت ہے اور غم و حیرت میں پیٹنا مادرِ اسحٰق کی سنت ہے۔ ایک کو ناجائز اور دوسری کو جائز کہنا کیوں کر درست ہوگا؟

نوٹ:۔ جب مخالفین کو قرآن سے ثبوت ماتم پیش کر دیا گیا تو بعد کے ملاؤں نے "صکت" کے معنی کو تبدیل کرنے کی کوشش کی اور اس کا

ترجمہ پیٹنے کی بجائے منہ پر ہاتھ رکھنا کیا ہے۔ لہٰذا ناظرین سے گزارش ہے کہ وہ لغت میں صکت کے معنی ضرور دیکھیں۔ غیاث اللغات صفحہ ۲۹۲ میں صک کے معنی کوفتن زدن ہیں۔

فیروز اللغات عربی مطبوعہ دین محمدی پریس لاہور میں "صک" کے معنی کوٹنا، ٹھونکنا لکھا ہے۔ لغات القرآن پرویز صفحہ ۱۰۳ میں صک کسی چیز پر یا بالخصوص چوڑی چیز کے ذریعہ زور سے مارنا مرقوم ہے۔ غلام احمد پرویز صاحب کے معتقدین دیکھ لیں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ عورتوں کا قاعدہ ہے کہ جب وہ بات کرنے لگتی ہیں منہ پر ہاتھ رکھ لیتی ہیں اسی طریق پر بی بی صاحبہ نے منہ پر ہاتھ رکھا۔ لیکن اگر یہ توضیح درست مان لی جائے تو کلام خداوندی معاذاللہ مجروح قرار دیا جائے گا کیونکہ "صک" بمعنی ہاتھ رکھنے کے معنی میں کبھی استعمال نہیں ہوتا ہے بلکہ ہاتھ سے یا کسی اور شے سے زور مارنے کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ خدا کا کلام غلط الفاظ کے استعمال سے منزہ و مبرا ہے۔ پس تعصب اور عزاداری کی مخالفت کی بناء پر قرآن میں تحریف معنوی کرنا جائز نہیں ہو سکتا ہے۔

دوم یہ کہ محض نسوانی عادت کو آیت میں بیان کرنا کلام کو عبث کر دیتا ہے۔ اور اللہ کا کلام فضولیات سے پاک ہے۔ پس تسلیم کرنا پڑے گا کہ بی بی سارہ نے اپنے منہ کو پیٹا اور پیٹنا حیرت و افسوس کی وجہ سے تھا نیز یہ کہ بہت کم عورتیں بات کرتے وقت منہ پر ہاتھ رکھا کرتی ہیں۔ یہ عام

قاعدہ بالکل نہیں ہے۔ اور پھر چلّاتے ہوئے آنا بھی اس امر کی دلیل
ہے کہ بی بی نے منہ پیٹا۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ بی بی ضعیفہ تھیں لہٰذا ان کا اولاد کی
بشارت مل جانے پر منہ پیٹ لینا بعید از عقل ہے۔ لیکن یہ محض پُر فریب
بات ہے کیونکہ بی بی نے جب منہ پیٹا تھا اس وقت تک انہیں بشارتِ خدا
کا علم نہ تھا کیونکہ فرشتے اجنبی مہمان بن کر ان کے گھر آئے تھے۔ اور سورہ ہود
میں ہے کہ

" اور اس کی عورت کھڑی تھی " وہ ہنسی۔ پھر ہم نے اس کو اسحٰق کی
بشارت دی اور اسحٰق کے بعد یعقوب کی۔ بولی یٰویلتیٰ (خرابی
میری) کیا میں جنوں گی حالانکہ میں بوڑھی ہوں اور میرا شوہر پیر مرد
ہے۔ یہ تو تعجب کی بات ہے!!"

غور فرمائیں کہ اللہ نے بی بی کے کھڑے ہونے اور ہنسنے کا ذکر پہلے
فرمایا۔ بعد میں بشارت کا ذکر ہے۔ اس کے بعد بی بی نے یہ کہا "یٰویلتیٰ"
اور اظہارِ تعجب کیا۔ پس چیخنے، اظہارِ تعجب کرنے کے قرائن ماتم کا ثبوت
ہیں۔ اگر بی بی سارہ خوش ہوتیں تو "یٰویلتیٰ" کہہ کر واویلا نہ کرتیں اور
نہ ہی چیختی چلاتی اور منہ کو پیٹتیں۔

بَین و واویلا کرنا اور قرآن

رونے اور پیٹنے کے بعد واویلا کو لیجئے اور قرآن مجید کے چھٹے[6]

پارے کی پہلی آیت دیکھئے۔

لا یحب اللہ الجھر بالسوء من القول الا من ظلم ... الخ
یعنی جہر سوء حرام ہے لیکن مظلوم کے لئے نہیں[1]۔ (سورۃ نساء)

اس آیت سے پوری طرح واضح ہے کہ مظلوم کے لئے ہر قول سوء
بولنے کی اجازت ہے۔ پس چونکہ امام حسین علیہ السلام اور ان کے اصحاب
مظلوم ہیں لہٰذا ان کی عزاداری کرنا جائز ہے۔

مصیبت کے وقت پکارنا اس لئے بھی منافی صبر نہیں ہے کہ خود
خدا کہتا ہے کہ مصیبت کے وقت کہو کہ "انا للہ وانا الیہ راجعون"۔
جیسا کہ سورۃ البقرہ کی آیت ۱۵۶ ہے کہ،

— ولبشر الصابرین ۵ الذین اذا اصابتھم مصیبۃ
قالوا انا للہ وانا الیہ راجعون ۵ یعنی صبر کرنے والوں کو
خوشخبری دو وہ جنہیں جب کوئی مصیبت پہنچتی ہے وہ کہتے ہیں ہم اللہ کے
لئے ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔

معلوم ہوا وقتِ مصیبت خدا کو پکارنا صبر کے خلاف نہیں ہے پس
چونکہ عزاداری حجتِ خدا کی مصیبت کے لئے کی جاتی ہے اور خدا کے خلاف
گلہ شکوہ نہیں کیا جاتا ہے۔ اس لئے نہ ہی منافی صبر ہے اور نہ ہی
ممنوع و مذموم ہے۔ اگر مصیبت کے وقت خاموش رہنا صبر ہوتا تو پھر
انا للہ .... کہہ کر خاموشی توڑنے کا حکم نہ ہوتا۔

۱؎ یہ مفہوم شرح صحیح بخاری کے مطابق لکھا گیا ہے۔

"صداقتِ صدیق پر اعتبار کیجئے"

وفات رسالت مآب صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کے غم ناک موقع پر حضرت ابوبکر کی عزاداری

یَا عَیْنُ فَابْکِی وَلَا تَسْأَمِیْ	وَحَقَّ الْبُکَاءُ عَلَی السَّیِّدِ
عَلٰی خَیْرِ خِنْدَفَ عِنْدَ الْبَلَاءُ	اَمْسٰی یُغَیَّبُ فِی الْمُلْحَدِ
وَصَلَّی الْمَلِیْکُ وَلِیُّ الْعِبَادِ	وَرَبُّ الْعِبَادِ عَلٰی اَحْمَدِ
فَکَیْفَ الْحَیَاۃُ لِفَقْدِ الْحَبِیْبِ	وَزَیْنِ الْمَعَاشِرِ فِی الْمَشْهَدِ
فَلَیْتَ الْمَمَاتُ لَنَا کُلِّنَا	فَکُنَّا جَمِیْعًا مَعَ الْمُهْتَدِیْ

ترجمہ

تو اے آنکھ خوب رو اب یہ آنسو نہ تھمیں	قسم ہے سرورِ عالم پر رونے کے حق کی
خندف کے بہترین فرزند پر آنسو بہا	جو غم والم کے ہجوم میں سرِ شام گوشۂ قبر میں چھپا دیا گیا
مالکُ الملک بادشاہ عالم بندوں کا والی	اور پروردگار احمد مجتبیٰ پر سلام و رحمت بھیجے
اب کیسی زندگی جو حبیب ہی بچھڑ گیا	اور وہ شہ رہا جو زینت وہ یک عالم تھا
کاش! موت آتی تو ہم سب کو ایک ساتھ آتی	آخر ہم سب اس زندگی میں بھی ساتھ ہی تھے

(حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ المتوفی ۱۳ھ / ۶۳۴ء)

منقول از روزنامہ نوائے وقت ملتان (شب برات ایڈیشن) ۱۷ اپریل ۱۹۸۱ء

فائدہ:-

اگر نوحہ خوانی، مرثیہ خوانی، گریہ زاری اور عزاداری شرعی اعتبار سے

ناجائز یا حرام ہوتی تو اہل سنۃ والجماعۃ کے صدیق اکبر، خلیفہ راشد اوّل، ثانی اثنین، حضرت ابوبکر عظیم الشان کے موجودہ مقام کو اور بلند فرماتے ہرگز ہرگز وفات یار پر، انتقال سید الابرار پر ایسا پُرسوز، درد سے بھرپور، گریہ کناں نوحہ بلند نہ کرتے۔ پس حضرت صاحب کا کلام ثابت کرتا ہے کہ محبتِ خدا کے غم فراق میں عزاداری کی مراسم ادا کرنا شریعتِ اسلام میں ممنوع و مذموم ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ سیرتِ صحابہ و خلفائے راشدین ہے۔

ہم نے عقلاً و نقلاً دونوں پہلوؤں سے جوازِ عزاداری کے اثبات پیش کر دیئے۔ اب فیصلہ آپ کے ذہن اور قلوب کریں گے۔ آپ کو اختیار ہے تسلیم کریں یا نہ کریں میرا مقصد تو یہ ہے کہ کم از کم غور تو کریں۔ اگر میری تحریر میں کوئی تشنگی رہ گئی ہو تو خط و کتابت کریں۔ بندہ ہر مناسب خدمت کے لئے حاضر ہے۔

نوٹ:- شیعہ کتب میں کچھ روایات عزاداری کے خلاف موجود ہیں۔ لیکن وہ اکثر ضعیف و موضوع ہیں یا پھر ان کا تعلق عام میت سے ہے۔ لہٰذا ایسی سب روایات کی جانچ پڑتال کر کے استدلال کیا جائے۔ ورنہ ہمارا دعویٰ ہے کہ ہمارے ہاں کوئی ایک بھی صحیح و مرفوع حدیث ایسی موجود نہیں ہے جس میں عزاداری امام حسین علیہ السلام کے ناجائز ہونے کا حکم عام ہو۔ اس دعوے کو جھٹلانے والے کو ایک ہزار روپیہ نقد انعام پیش کیا جائے گا۔

ـــــــــــــــــ

دوسرا سوال

سوال نمبر ۲ زنجیر وغیرہ سے ماتم کیونکر جائز ہے؟

جواب بر۲ معیارِ محبت یہ رہتا ہے کہ محبوب کی ہر ادا کے ساتھ پورے خلوص، دیانتداری اور ایمان داری سے محبت کی جائے۔ اس کے تمام اقوال و افعال کو پسند کیا جائے۔ کیونکہ محب کا مطلوب صرف اس کا محبوب ہوتا ہے۔ وہ ہر حال میں اپنے محبوب کی رضا میں راضی رہنا چاہتا ہے اگر اسے اپنا محبوب کسی دُکھ میں نظر آتا ہے تو اس کو ہرگز برداشت نہیں کر سکتا اور کوشش کرتا ہے کہ وہ اسے اس تکلیف سے چھٹکارا دلا دے یا خود بھی اس میں مبتلا ہو جائے۔ چنانچہ عشقِ حقیقی میں کوئی عاشق اپنے معشوق کی خاطر اس کی محبت میں بے چین ہو کر کوئی ایسا فعل کرے جس کا مقصد یہ ہو کہ معشوق کی تکلیف رفع ہو جائے یا پھر وہ تکلیف خود اسے بھی آ جائے تو یہ کوئی عیب نہ گنا جائے گا۔ بلکہ علامت اخلاص محبت ہو گا۔

یقیناً آپ کا دل یہ گواہی دے گا کہ عاشق اپنے معشوق کی خاطر کٹ مرنا اپنی کامیابی سمجھتا ہے۔ ابتدا سے آج تک کسی روحانی یا دنیوی عاشق کو دیکھیے اسی اصول کا معتقد ملے گا۔ "دین" عشقِ حقیقی کا ہی نام تو ہے۔ ہر دینی عاشق ایسا ہی ملے گا جس نے محبوب کی خاطر قربانی دی۔ محبت میں اپنے آپ کو زخمی کر لینا تو کمتر ہے عاشقوں نے تو گنبۂ جاہ و جلال، اولاد و مال و

جان تک سب کچھ قربان کر دیا۔ انبیاؑ کی مثالیں آپ کے سامنے ہیں۔

ہم زنجیر مارتے ہیں تو حبِ اہل بیتؑ میں یہی وجہ ہے کہ ہم اس وقت تکلیف کی پرواہ نہیں کرتے۔ اس کے برعکس اگر عام زندگی میں سوئی بھی لگ جائے تو ناقابلِ برداشت ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں ہر چیز کی واضح نشانی اور ہر مسئلے کا حل مضمر ہے بشرطیکہ قرآن کو محمدؐ و آلِ محمدؐ کی ہدایات و تعلیمات سے سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

مطالعۂ قرآن حکیم سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ جب خدا کسی برگزیدہ ہستی کو اپنا خلیل بناتا ہے تو اسے آزمانے کے لئے چھری و خون کی آزمائش میں ڈال دیتا ہے۔ جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قربانیٔ فرزند کا واقعہ موجود ہے کہ خدا نے ابراہیمؑ کی محبت کو خون و چھری سے پرکھا۔ چنانچہ ابراہیمؑ نے اپنے خونِ جگر، نورِ چشم حضرت اسمٰعیلؑ کے گلے پر چھری چلانے کا ارادہ فرمایا اور خلیل بن گئے۔ اور آج اُن کی سنت پر مسلمان قربانی دیتے ہیں۔ (واضح ہو کہ اولاد اپنی جان سے بھی عزیز ہوتی ہے لہٰذا خدا نے بجائے حضرت ابراہیمؑ کے حضرتِ اسمٰعیلؑ کی گردن کو امتحان کے لئے منتخب کیا۔ نیز یہ کہ اولاد بھی تو اپنا خون ہی ہوتی ہے)

اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ اپنی محبت کی سچائی کے ثبوت میں اپنا خون بہانا سنتِ ابراہیمی ہے اور منشائے خداوندی کے مطابق ہے کہ اس قربانی سے عشق کے امتحان میں خُلّت کی سند ملتی ہے لہٰذا تقربِ خدا کے لئے محبتِ خدا میں خوشنودیٔ خدا کی خاطر اپنا خون بہانا قرآنی اعتبار

سے مستحسن ہے۔

اگر اسمٰعیلؑ کے ذبح ہونے سے بچ جانے پر مسلمان عید مناتے ہیں تو محمد مصطفیٰؐ کے فرزند عالی مقام کے ذبح ہونے پر سوگ کیوں نہ منایا جائے؟ حضرت اسمٰعیلؑ فرزند ابراہیمؑ کی گردن پر چھری رکھی گئی تو مسلمان کروڑوں جانور ذبح کر دینا ثواب سمجھتے ہیں اور حسینؑ فرزند رسولؐ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ذبح ہو گئے تو چند قطرے خون بہانا کیوں برا سمجھا جاتا ہے۔؟

اس طرح قرآن مجید میں ہے کہ حضرت یوسفؑ کی جدائی میں حضرت یعقوبؑ کی دونوں آنکھیں غم و رنج سے سفید ہو گئیں۔ جیسا کہ ارشاد ہوا۔ "و ابیضت عیناہ من الحزن وھو کظیم" سے معلوم ہوتا ہے کہ محبت خدا کے غم و رنج میں اگر جسم کا کوئی عضو بھی ضائع ہو جائے تو مذموم نہیں ہے۔ چہ جائیکہ چند قطرے خون بہانا برا سمجھا جائے۔

سبحان اللہ! ذرا غور تو کیجئے حضرت اویس قرنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر جنہوں نے محبت رسولؐ میں اپنے بتیس ۳۲ دانت نکال دیئے۔ عاشق جو تھے۔ یہ واقعہ سیرت حلبیہ جلد ۲ صفحہ ۲۹۵ پر ملاحظہ کیجئے۔ اور روایت اہلسنت پر غور کر کے فیصلہ کیجئے کہ کسی محب کا محبوب کے دکھ میں شریک ہو کر اس کی یاد تازہ کر لینا گناہ ہے نیز یہ کہ جب حضرت اویسؓ نے اپنے دانت توڑے تو خون نکلا ہو گا یا نہیں؟

ہم تو محض سینہ زنی کرتے ہیں یا اپنے جسم کو زخمی ہی کرتے ہیں حضرت اویس قرنیؓ عاشق رسولؐ نے تو اس سے بڑھ کر کیا۔ اب فیصلہ کیجئے۔

کہ کیا جناب اویسؓ کا یہ فعل بربنائے عشق رسولؐ جائز تھا یا نہیں؟ جو کچھ جواز حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ کے ایسے عاشقانہ فعل عظیم کے متعلق پیش کر دیں وہی ہمارے ماتم بالخصوص ماتم زنجیر کے متعلق سمجھیں کیونکہ ہمارا ماتم زنجیر تو فعل جناب اویسؓ سے کہیں کمتر ہے..... اہل سنت ہی کی کتب سے یہ ثابت ہے کہ حضرت اویس قرنیؓ جناب علیؑ کی فوج میں شامل ہو کر معاویہ کے خلاف جنگ صفین میں لڑے۔ اب خود انصاف کیجئے کہ دونوں فوجوں میں سے محبت رسولؐ کس فوج میں تھی؟ اور ان دونوں لشکروں میں سے کون سا لشکر حق پر تھا؟ جبکہ جنگ صفین میں لشکر معاویہ نے حضرت اویسؓ جیسے عاشقان رسول کا خون بہایا۔

حضرت یعقوبؑ کا جو واقعہ ہم نے بیان کیا کہ آپؑ نے محبت خدا فرزند کی جدائی میں اپنی آنکھوں کو سفید کر لیا صریحاً ثابت کرتا ہے کہ محبت محبت اللہ میں اگر جزو جسم بھی جاتا رہے تو بھی سنت نبی خدا ہے چہ جائیکہ زنجیری ماتم تو اس سے بہت ہی کم چیز ہے۔

عام طور پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ رسول خدا یا آئمہؑ نے کب فرمایا کہ ماتم کیا جائے یا زنجیر مارے جائیں؟ اس کا جواب یہ ہو گا کہ اویسؓ کو کب حضورؐ نے فرمایا کہ میری محبت میں سارے دانت توڑ ڈالنا؟ حضرت بلالؓ اور بی بی عائشہؓ کو کب حکم دیا کہ میری وفات پر سر اور منہ پیٹ کر فریاد کرنا؟ چنانچہ جواب یہی ہو گا کہ یہ سب کچھ محبت و غم میں ہوا۔ کیونکہ خدا یا رسولؐ نے حرام نہیں کیا تھا۔ اگر حکم دے

کر ماتم کروایا جاتا تو محبت کا پتہ نہ چلتا اور معلوم نہ ہوتا کہ دردِ اہلبیتؑ
رسولؐ کس کے دل میں ہے اور کس کے دل میں نہیں ہے۔ چونکہ دلوں
کی محبت کا امتحان مقصود تھا۔ اگر اس لئے حکم دے کر فرض نہیں کیا تاکہ
محبین و معاندین ظاہر ہو جائیں۔

کہا جاتا ہے خون ناپاک ہے لیکن ہم کہتے ہیں کہ پھر زخمی مجاہدین
جہاد میں نماز ترک کیوں نہیں کر دیتے؟ اس لئے کہ جہاد بھی تو مظاہرہ
عشقِ الٰہی ہے معلوم ہوا کہ عشقِ حقیقی میں بہے تو خون نماز کو مانع نہیں
ہے جبکہ ہم تو غسل کر کے نماز ادا کرتے ہیں۔

مستدرک حاکم، صواعق محرقہ اور تاریخ الخلفا علامہ سیوطی میں
حضرات اہلسنت کا قول تحریر کیا گیا ہے کہ "ما راٰہ المسلمون حسنا
فھو عند اللہ حسن" یعنی جس چیز کو مسلمان اچھا سمجھیں وہ خدا کے
نزدیک بھی اچھی ہے۔ ہم اس قول کو بطور دلیل پیش کرتے ہیں کہ زنجیری
ماتم اچھا ہے۔ اس لئے خدا کے نزدیک بھی اچھا ہے لیکن یہ مت کہا جائے
کہ صرف ایک فرقہ کے پسند کر لینے سے کیا ہوتا ہے جب دوسروں کا
اتفاق نہ ہو تو پھر ہم بھی کہہ دیں گے کہ سقیفہ کا اجماع' اور خلافتیں
بھی اسی زمرہ میں آ جائیں گی۔ اس کے علاوہ تراویح وغیرہ کے لئے
بھی سوچ لیجئے۔ اور غیر شیعہ کی صبح کی اذان میں الصلوٰۃ خیر من
النوم بھی تو بقولِ شبلی اپنی مرضی سے ہی بعد از رسولؐ بڑھا لیا
گیا۔ الفاروق کا باب اولیات پڑھ لیجئے۔

بعض حالات میں زنجیری ماتم فرض بھی ہو جاتا ہے وہ یوں کہ ہر
مستحب امر کی نذر شرعاً کی جا سکتی ہے اور اس کا عہد بھی کیا جا سکتا ہے
جیسا کہ ہر اسلامی فرقہ کا عقیدہ اور مذہب ہے اس لئے عزاداری کے
کسی بھی مستحب فعل کی جس میں زنجیری ماتم بھی شامل ہے۔ اگر کوئی شخص
نذر کرے یا عہد کرے تو اس کا پورا کرنا اس کے لئے واجب ہو جائے گا۔
کیونکہ قرآن مجید سورہ بنی اسرائیل رکوع ۴ کی آیت ۳۴ ہے کہ:۔
" اوفو بالعھد ان العھد کان مسئولا" کہ پورا کرو عہد کو
تحقیق عہد کے متعلق پوچھا جائے گا اور سورۂ دہر رکوع ۱ آیت ۷
ہے کہ "یوفون بالنذر ویخافون یوما کان شرہ مستطیرا" یعنی یہ
لوگ نذر کو پورا کرتے ہیں اور اس دن سے ڈرتے ہیں جس کا شر اور خوف
عام ہوگا۔

اب بھی اگر زنجیری ماتم کے لئے کوئی شبہ کی گنجائش ہے تو پھر اس
کے مدمقابل اس فعل کے ناقص ہونے کی دلیل میں قرآنی حکم بتائیے یا کوئی
متفق علیہ معتبر حدیثِ رسولؐ پیش کر دیجئے کہ جس سے زنجیری ماتم حرام ثابت ہو۔
تعجب ہے کہ مزاروں پر اپنے جذبات کو تسکین دینے کے لئے قوالیاں
سن کر صوفیاً کا ناچنا "حال" کہہ کر جائز بتایا جاتا ہے لیکن غمِ حسینؑ میں ماتم
کرنے کو ناجائز کہا جاتا ہے۔ ہم نے خود کئی صوفیوں کو ناچتے دیکھا ہے جیسا کہ
لاہور میں لالو سائیں مشہور تھا۔ اور قصور والے حضرت بلھے شاہ صاحب کا
شعر بھی گواہ ہے جس کا مصرعہ بزبان پنجابی یوں ہے:۔

"رُسیا یار نہ ساڈے نال بولے تے پنجے کے منانا پے گیا"

صوفیا اکثر بیان کرتے ہیں کہ بلھے شاہ صاحب اپنے پیر صاحب کو منانے کے لئے اُن کے سامنے رقص فرماتے تھے۔

بتائیے یہ ناچنا بدعت ہے یا نہیں؟ یہ کیا بات ہوئی کہ طبلے باجے جائز اور ماتم ناجائز۔ راہِ خدا انصاف کیجئے مزاروں میں مسجدیں موجود ہیں وہاں علماء بھی ہوتے ہیں لیکن وہ منع نہیں کرتے آخر کیوں؟ ماتم کے جلوسوں کو بدعت کہنے والوں سے ہم بھی تو پوچھ سکتے ہیں کہ عید میلاد النبیؐ کے جلوس میں ڈھولکے چمٹے بجانا آخر کس کی سنّت ہے؟

اگر واقعہ کربلا کے بعد آئمہ طاہرینؑ نے زنجیر زنی نہیں کی ہے تو پھر یہ قوالیاں اور محافلِ سماع کس امام نے رائج کرنے کی ابتدا کی ہے۔

بات وہی آ ئے گی کہ چونکہ شریعت میں حکم ممانعت وارد نہیں ہے لہٰذا اسے ناجائز کہنا درست نہیں ہے۔ باقی حضراتِ گرامی قدر! آئمہ اطہارؑ کی زندگیاں مخالف حکومتوں کی نگرانی میں گذریں اور ہر امام پر ظلم و ستم کے پہاڑ ڈھائے گئے عزاداری پر کڑی پابندیاں عائد کی گئیں اور شیعوں کو چن چن کر ختم کیا گیا۔ ایسے حالات میں بھلا یہ کس طرح ممکن تھا کہ آئمہؑ عزاداری کی رسومات علانیہ بجالاتے البتہ حالتِ تقیہ میں مومنین کرام عزاداری سید الشہداؑ سے کبھی بھی غافل نہ رہے۔

صاحبان! اپنا خون بہانا بڑی جرأت کا کام ہے جب تک کوئی اندرونی جذبہ محبت جوش نہ دلائے ایسا نہیں ہو سکتا۔ عام زندگی میں ہم معمولی سوئی کے لگ جانے کی تکلیف کو محسوس کرتے ہیں کیونکہ جذبہ حب کو تحریک نہیں ہوتی لیکن جونہی اندرونی محبت کے جذبات میں ہیجان آتا ہے تو بالکل ابراہیمؑ کی سنّت کو تازہ کرتے ہوئے ہم اپنے

آپ کو گرمی سردی کی پرواہ کئے بغیر تیز دھار نوکیلی چھریوں کے حوالے کر دیتے ہیں۔ دہکتے ہوئے انگاروں پر ننگے پیروں ماتم کرتے ہیں اور کوئی تکلیف محسوس نہیں کرتے۔

آپ نے قرآن مجید میں قصہ یوسفؑ ضرور پڑھا ہوگا حضرت زلیخا پر جب ان کی سہیلیوں نے اعتراض کیا تو آپ نے ہر عورت کو ایک چھری اور ایک پھل تقسیم کر دیا اور کہا کہ اس پھل کو کاٹو۔ ادھر حضرت یوسفؑ کو ان کے سامنے سے گذارا لیکن عورتوں نے پھلوں کے بجائے اپنے ہاتھ ان چھریوں سے کاٹ لئے۔ تابِ حسنِ یوسفؑ برداشت نہ ہو سکی۔ پس میدانِ عشق میں نظارۂ حسن کی پہلی جھلکی ہی اپنا خون بہانے پر مجبور کر دیتی ہے اور خود کو خبر تک نہیں ہوتی اور یہ لطف عاشقِ صادق ہی جان سکتے ہیں۔

زنجیری ماتم کی سائنسی و معجزاتی دلیل

ماتم زنجیر ہم عزاداروں کیلئے ایک انتہائی معتبر اور بھاری دلیل ہے اور مجھے اسے معجزاتی دلیل کہتے ہوئے کوئی تامل محسوس نہیں ہوتا ہے کہ دنیائے سائنس کا متفقہ فیصلہ ہے کہ اگر کسی شخص کے خون میں غیر گروپ کے خون کے ایک قطرہ کا ہزارواں حصّہ بھی مل جائے تو اس شخص کی موت یقینی ہے۔ آپ حلقہ ماتم میں ملاحظہ فرما سکتے ہیں کہ مومنین ماتمی حضرات بلا امتیاز چھینا جھپٹی کر کے ایک دوسرے کی استعمال شدہ خون آلود چھریوں کی زنجیریں اپنے اجسام پر مارتے ہیں اور ظاہر ہے ایک جسم میں دوسرے جسم کا خون ضرور مل جاتا ہے اور خطرناک مقدار سے اس آمیزہ خون کی مقدار یقیناً زیادہ ہوتی ہے مگر یہ اعجاز ہے کہ وہ مبینہ زہر قاتل بے ضرر ثابت ہوتا ہے اور ماتم دار صدقۂ حسینؑ سے محفوظ رہتے ہیں۔ یہ ایک ایسی دلیل ہے جس سے انکار کرنا محال ہے۔

تیسرا سوال

سوال ۳: کیا تعزیہ اور گھوڑا نکالنا ٹھیک ہے جبکہ گھوڑے کو ذاتی استعمال میں بھی لایا جاتا ہے۔ کیا یہ شرک نہیں ہے؟

جواب ۳: اگرچہ یہ خیال کہ تعزیہ داری اور ذوالجناح نکالنا شرک ہے خود محتاج دلیل و ثبوت ہے تاہم جواباً عرض یہ ہے کہ ہم تعزیہ یا ذوالجناح کو نہ تو خدا سمجھتے ہیں اور نہ ہی خدا کا شریک اس لئے اس کی پرستش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

یہ تو واقعات کربلا کی یادگاریں ہیں اور ہمارے لئے اسباب عزاداری بھی کہ کسی چیز کو نشانی قرار دے کر عزاداری کرنا فعلِ رسولؐ سے پوری طرح ثابت ہے جیسا کہ جناب سرورِ کائناتؐ نے خاکِ کربلا کو نشانی قرار دے کر گریہ فرمایا بارہا مگر ملاحظہ کیجئے مسند احمد بن حنبل والی روایت جو ہم نے پہلے سوال کے جواب میں لکھی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول مقبولؐ نے خاکِ کربلا سامنے رکھی اور روئے لہٰذا تبرکات عزاداری کا اجمالاً استحباب ثابت ہو گیا۔ کہ وقت کے لحاظ سے رسول اللہؐ کے زمانہ میں صرف دو ہی نشانیاں ہو سکتی تھیں، ایک ذاتِ حسین علیہ السلام اور دوسری خاکِ کربلا چنانچہ حضورؐ نے دونوں نشانیوں کو مدِ نظر رکھ کر امت کو بتا دیا کہ نشانی کو سامنے رکھنا میری سنت ہے۔ آج جبکہ ہمیں واقعاتِ کربلا کا علم مکمل طور پر ہے تو اس کی تفصیل کے لئے ہم الگ الگ یادگار قائم کرتے ہیں، یہ عین سنّتِ رسولؐ ہے اسی سلسلے کی ایک روایت اور ملاحظہ فرمائیے۔ اہل سنت حضرات کی مشہور کتاب مشکوٰۃ المصابیح میں ہے کہ:

"ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا خاکِ کربلا کا تذکرہ کرنے کے بعد کہتی ہیں پس رسولؐ نے سونگھا تو فرمایا تکلیف اور بلا کی بو آ رہی ہے پھر ام سلمہؓ سے

ارشاد فرمایا اے امِ سلمہؓ جب یہ خاک خون ہو جائے تو سمجھ لینا میرا فرزند حسینؑ شہید ہو گیا پس امِ سلمہؓ نے اس خاک کو ایک شیشی میں رکھ لیا، روزانہ اس کو دیکھا کرتی تھیں اور کہا کرتی تھیں کہ جس دن تو خون بن جاوے گی بے شک وہ بڑی مصیبت کا دن ہوگا اور روایت ہے کہ جب حسینؑ شہید ہوئے تو آسمان سات دن اور رات خون کی طرح سرخ رہا۔" (مشکوٰۃ المصابیح مطبوعہ فاروقی دہلی ص۶)

لہٰذا یہ بات تسلیم کرنی چاہیئے کہ کسی واقعہ کی یاد کے لئے کسی نشانی کا تعین کر لینا کوئی بُری حرکت نہیں ہے۔

اسی طرح قرآنی قصہ حضرت یعقوبؑ کا ہے کہ جب حضرت یوسفؑ ان سے جدا ہوئے تو آپؑ یوسفؑ کے کرتے کو دیکھ کر "ہائے یوسفؑ افسوس" کہہ کر واویلا کیا کرتے تھے اور گریہ فرماتے تھے حضرت یعقوبؑ کے دوسرے بیٹے آپؑ کی اس عزاداری کو ناگوار سمجھا کرتے تھے معلوم ہوا کہ مظلوم نشانی سامنے رکھ کر عزاداری کرتا ہے اور ظالم اسے بُرا جانتا ہے۔

جب حضرت عثمان بن عفان کے قتل کے بعد قصاص کا غوغا اٹھایا گیا تو بھی ان کے خون آلود کرتے کی تشہیر کر کے پروپیگنڈا کیا گیا۔ اللہ نے قرآن مجید میں اکثر نشانیوں کو قائم کرنے کا حکم دیا ہے مثلاً — حج ایک اہم اسلامی رکن ہے یہ کیا ہے؟ یادگار ہے حضرت ابراہیم و اسمٰعیل اور ہاجرہ صلوٰۃ اللہ علیہم کی۔ یوم ترویہ، یوم عرفہ بھی نشانیاں ہیں۔ قربانی کرنا، صفا و مروہ کے درمیان بھاگنا یہ سب واقعات کی یاد ہی تو تازہ کرتے ہیں اور انہیں شعائر اللہ کہتے ہیں۔ لہٰذا ماننا پڑتا ہے کہ خاصانِ خدا کی یاد کو قائم کرنا نہ صرف مستحسن ہے بلکہ اتنا اہم ہے کہ خدا نے اکثر حالات میں انہیں واجب ارکان میں داخل کر دیا ہے ارشادِ خداوندی ہے کہ جو شخص خدا کی نشانیوں کی تعظیم کرے پس وہ دل کے تقویٰ سے ہے۔ (سورۃ حج) اللہ نے صرف نبیوں کی نشانیاں قائم نہیں

کیں بلکہ غیر انبیا کی بھی حضرت ہاجرہ کے واقعات کو قابلِ یادگار قرار دیا گیا۔ وہ پانی کی تلاش میں صفا و مروہ کے درمیان دوڑی تھیں تو حاجیوں پر فرض ہو گیا کہ وہ بھی دوڑیں۔

پس خاصانِ خدا کے واقعات کی یادگار قائم کرنا خلافِ منشائے الٰہی نہیں بلکہ پسندیدۂ قدرت ہے۔ غور کریں خلیل اللہؑ کے واقعہ قربانی کی یادگار خدا کو جب اتنی محبوب ہوئی کہ اس کو جاری کر دیا تو خاتم المرسلینؐ کے فرزند ذبحِ عظیم کی یادگار کیسے خدا کی مرضی کے خلاف ہو سکتی ہے؟ خدا اپنی سنت ہرگز نہیں بدلتا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ہے کہ تم خدا کی سنت میں کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے۔ جب دیگر انبیاء اور ان کی آل کی نشانیاں لائقِ احترام ہیں تو ہمارے نبیؐ اور ان کی اولاد کی نشانیاں بھی واجب التعظیم ہیں کیونکہ ہمارے رسولؐ تو تمام انبیاء و مرسلین کے سردار ہیں۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ پرانی بات دہرانے کا کیا فائدہ؟ تو رسوماتِ حج ان کے لئے واضح جواب ہیں۔ حاجیوں کا تین شیطانوں کو پتھر مارنا نقل کو اصل تصور کر لینے کے علاوہ کیا ہے؟ ورنہ ثابت کیا جائے کہ فی الواقع وہاں پر تین شیطان نظر آتے ہیں۔

اگر دنبہ حضرت اسمٰعیلؑ کی جگہ ذبح ہوتا ہے اور حضرت ذبیح اللہؑ کی جان بچ جاتی ہے تو مسلمان کئی لاکھ دنبے ذبح کر دیتے ہیں پھر آخر اس میں تامل کیوں ہو کہ گھوڑے نے حسینؑ سے حقِ وفاداری ادا کیا اور حضرتؑ کا ساتھ دیتا رہا اس کی شبیہ بنائی جاوے اعتراض پہلے خدا پر کیجئے کہ اس نے اپنے برگزیدہ بندوں کی نشانیاں کیوں بنائیں اور ان کے احترام کا حکم کیوں دیا۔ اس کے بعد شیعوں سے سوال کریں۔ گھوڑے کی تعریف تو خدا نے قرآن میں قسمیں کھا کر فرمائی ہے۔ دیکھئے "والعادیات"

حضرت ہاجرہؑ اگر حضرت اسمٰعیلؑ کے لئے پانی کی تلاش میں بھاگتی ہیں تو سب حاجی نقلاً دوڑتے ہیں لیکن اگر جناب عباسؑ علم اور مشکیزہ لے کر دریا کو جاتے ہیں تو ان کی نشانی شاق کیوں گذرتی ہے۔

دستورِ محبت یہ ہے کہ محبوب کی ہر نشانی سے پیار کیا جائے مگر کچھ لوگ اس

حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر اصل نشانیاں ہوں تو ہم ان کو محترم ماننے کو تیار ہیں لیکن یہ تو نقلیں ہیں لہٰذا اس شبہ کو ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی مندرجہ ذیل حدیث سے دور کرتے ہیں جو کتب اہلسنت سے نقل کرتا ہوں۔

"ایک صحابی رسول اکرمؐ کے پاس آئے اور عرض کی کہ میں نے قسم کھائی ہے کہ جنت کے دروازے کی چوکھٹ کو چوموں اور حورِ عین کی پیشانی کو بوسہ دوں۔ رسول اللہؐ نے حکم دیا کہ ماں کے پاؤں اور باپ کی پیشانی چومو۔ مروی ہے کہ صحابی نے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ اگر ماں باپ نہ ہوں تو؟ ارشاد فرمایا ان کی قبروں کو بوسہ دو۔ صحابی نے کہا اگر مجھے ان کی قبریں بھی معلوم نہ ہوں تو فرمایا دو نشان کھینچو ایک ماں کی اور دوسرے کو باپ کی قبر تصور کرو۔ دونوں کو چومو اور اپنی قسم میں جھوٹے نہ ہو۔"

روایت اہلسنت امام شعبی کی کتاب کفایہ، کنز العباد، خزانۃ الروایات، مطالب المومنین اور فتاویٰ عالمگیری وغیرہ)

روایت بالا سے ثابت ہوا کہ اگر اصل نشانی نہ مل سکے تو خود نشانی بنانا کوئی جرم نہیں ہے۔ اسی لئے پانی پت اور کرنال (ہندوستان) میں دونوں جگہ بو علی قلندر کا مزار ہے جس سے ظاہر ہے کہ ایک جگہ اصل مزار ہے اور ایک جگہ نقل کیونکہ لاش تو ایک ہی تھی لیکن دونوں مزاروں پر عقیدتمند حضرات بلا عذر حاضر ہوتے ہیں۔

سنیوں کی مشہور کتاب حسن التوسل فی آداب زیارۃ افضل الرسل برحاشیہ الاتحاف مطبوعہ مصر صفحہ ۹۶ پر لکھا ہے کہ فعل مستحب میں جس چیز سے مدد ملے وہ بھی مستحب ہے لہٰذا ہم کہتے ہیں کہ ذوالجناح اور تعزیہ داری وغیرہ یادگار قربانی سید الشہدا علیہ السلام قائم رکھنے میں مددگار ہیں اور یادِ حسینؑ کو قائم رکھنے کو اگر فرض نہ مانیں تو کم از کم مستحب تو سمجھیں۔ (پس چونکہ تعزیہ داری سے یادِ حسینؑ منانے میں مدد ملتی ہے اس لئے مستحب ہے۔)

جہاں تک سنتِ حضور سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا سوال ہے آنحضرتؐ

نے خود امام حسینؑ اور امام حسنؑ کا مرکب بن کر ان کو دوش پر سوار کر کے یہ سنت فعلی سکھائی کہ حسینؑ کی سواری کی شبیہ بنا لینا کوئی معیوب عمل نہیں بلکہ میری سنت ہے تمام اہل اسلام اس پر متفق ہیں کہ حسین علیہ السلام راکب دوشِ سرکارِ ختمی مرتبتؐ تھے۔ (چنانچہ حضرت علی بن عثمان ہجویری المعروف داتا گنج بخش لاہوری اپنی مشہور تصنیف کشف المحجوب باب ۲ فصل ۲ اردو ترجمہ مطبوعہ فیروز سنز لمیٹڈ ص ۱۱۸ اور ص ۱۱۹ میں تحریر کرتے ہیں۔

"چنانچہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے میں ایک روز پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو میں نے دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کو اپنی پشت مبارک پہ بٹھا کر ایک رسّا اپنے دہن مبارک میں پکڑا ہوا ہے اور اس کے دونوں سرے امام حسین رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں میں تھما رکھے تھے اور وہ آنحضرتؐ کو چلا رہے تھے۔ اور خود صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھٹنوں کے بل چل رہے تھے جب میں نے یہ بات دیکھی تو میں نے کہا نعم الجمل جملک یا ابا عبد اللہ ترجمہ:۔ اے حسینؑ آپ کا اونٹ بہت ہی اچھا ہے۔ یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "نعم الراکب ھو یا عمرؓ" اے عمرؓ سوار بھی تو بہت ہی اچھا ہے۔"

داتا صاحب کے اس بیان کردہ واقعہ سے یہ نکتہ اخذ ہوتا ہے کہ حضورؐ نے اپنے دہن شریف میں رسّہ (بصورت لگام) پکڑ کر امام حسینؑ کے ہاتھوں دونوں سرے (بصورت باگ) تھما کر حسینؑ کو پشتِ مبارک پر بٹھا کر سواری حسینؑ کی نقل بھی بنائی تھی پس ثابت ہوا کہ حسینؑ کی سواری کی نقل بنانا سنت رسول کریمؐ ہے نہ کہ بدعت۔

اعتراض کیا جاتا ہے کہ گھوڑا ذاتی استعمال میں لایا جاتا ہے اور تعزیہ ہر سال نیا بنتا ہے اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ جب قرآن شریف پرانا ہو جاتا ہے تو اسے سپردِ خاک و آب کیوں کر دیا جاتا ہے۔ مسجد کے پرانے ہو جانے پر مرمت کیوں

کی جاتی ہے اور نئی کیوں بنائی جاتی ہے۔

ذرا غور کیجیے اینٹیں جب بھٹی میں ہوتی ہیں تو ان کی کوئی تعظیم نہیں کی جاتی ہے لیکن جب مسجد میں لگ جاتی ہیں تو لائق احترام ہیں اور پاک سمجھی جاتی ہیں لیکن جب پرانی ہو جاتی ہیں اور معمار انہیں اکھاڑ کر پھینک دیتے ہیں تو پھر ان کی کوئی قدر نہیں رہتی معلوم ہوا کہ اینٹ کی تعظیم مسجد سے وابستہ تھی۔ اسی طرح عام گھوڑا جب شبیہ نہیں ہے تو وہ صرف گھوڑا ہے لیکن جب شبیہ ذوالجناح ہے تو لائق احترام ہے اور جب وداع ہوا تو پھر محض گھوڑا۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ قدر و فضیلت کا تعلق نسبت سے ہوتا ہے۔ جب اینٹ مسجد وغیرہ میں ہے تو قابلِ عزت ورنہ عام خشت اور کوئی فضیلت نہیں۔ جب کاغذ سادہ ہے تو محض پرچہ لیکن اسی کاغذ پر اگر آیاتِ قرآنی لکھ دی جائیں یا چھپ جائیں تو لائق ادب۔ اسی طرح اگر وہ آیات محو ہو جائیں تو پھر کاغذ کا کاغذ۔ چنانچہ دیکھا نسبت کو پڑتا ہے اگر ہم گھوڑے یا تعزیہ کو منسوب کر دیتے ہیں تو احترام واجب ہے کیونکہ نسبت محترم ہے۔ لہٰذا نسبتِ امام مظلومؑ کو ملحوظ رکھتے ہوئے زیارات کا بنانا اور ان نشانیوں کا احترام کرنا عقلاً و نقلاً غلط فعل نہیں ہے۔

اگر حنفی حضرات کے امام اعظم کے نزدیک جوتی کا تصور[۱] قرب الٰہی کا وسیلہ ہو سکتا ہے تو کیا ہمارا گھوڑا قرب ذوالجناح کا ذریعہ بھی نہیں ہو سکتا؟ جب جوتے کا تصور بت پرستی اور شرک نہیں تو پھر احترام ذوالجناح شرک کیسے ہوا؟

روایت اہلسنت ہے کہ "حضورؐ غزوہ تبوک سے واپس آئے تو بی بی عائشہ کی گڑیاں دیکھیں جن میں "پردار گھوڑا" تھا۔ حضورؐ نے دریافت کیا کہ کیا گھوڑے کے پر بھی ہوتے ہیں؟ بی بی عائشہ نے کہا کہ آپ کو معلوم نہیں کہ

---

[۱] تاریخ بغداد بحوالہ استقصاء الافحام جلد ۲ ص ۲۳۱

حضرت سلیمانؑ کے گھوڑے کے پر تھے۔ حضورؐ مسکرا دیئے۔

(مشکوٰۃ شریف جلد ۲ صفحہ ۵۴ حدیث ۳۱۰۵)

روایتِ بالا سے ظاہر ہے کہ حضرت عائشہ نے جو پردار گھوڑے کے مجسمے کی تشریح کی اس سے حضرت سلیمان علیہ السلام کے پردار گھوڑے کی نقل بنانے کا جواز حاصل ہوتا ہے یعنی بی بی عائشہ نے شبیہ اسپ سلیمانؑ بنا کر خانۂ رسولؐ میں رکھی تھی اور حضورؐ نے منع فرمانے کے بجائے مسکرا کر اس فعل پر رضامندی کا اظہار کیا ہے۔

اب مزید بات یہ ہے کہ پردار گھوڑے کو عربی زبان میں "ذوالجناح" کہتے ہیں پس زوجہ رسولؐ نے "ذوالجناح" کی شبیہ بنا کر رضامندیٔ رسولؐ سے اپنے گھر میں رکھی۔ شاید اس لئے کہ حسینؑ کی سواری کو ذوالجناح کہا جائیگا اور یہ حدیث شبیہ ذوالجناح کی دلیل بن جائے گی اور جوازِ رضامندی رسولؐ ثابت کرے گی۔

پس اگر ہم شبیہ ذوالجناح بناتے ہیں تو ناجائز نہیں کیونکہ نہ ہی ہم گھوڑے کی پرستش کرتے ہیں اور نہ اُسے خدا یا اس کا شریک سمجھتے ہیں بلکہ محض ایک محترم یادگار سمجھتے ہیں۔ جس طرح مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ یا دیگر مقاماتِ مقدسہ کی تصاویر کو بھی محترم سمجھتے ہیں کیونکہ وہ اصل مقاموں کی نقلیں ہوتی ہیں اسی طرح ہم واقعاتِ کربلا کی نشانیاں اور نقلیں بنا لیتے ہیں تو کیا حرج ہے؟

ہم تو صرف گھوڑا نکالتے ہیں لیکن اب آپ حضرات تو اپنے جلوسوں میں اونٹ، بیل، ٹرک، لاریاں اور ہاتھی خوب سجا بنا کر نکالتے ہیں۔ شہر کرنال بھارت میں حضرت بوعلی قلندر کی یاد میں کاغذوں کا پنکھا بنا کر نکالا جاتا ہے۔ داتا صاحب اور دیگر بزرگوں کا سہرا بھی نکالتے ہیں اور صرف محترم نسبت کی وجہ سے ان چیزوں کو لائق احترام سمجھا جاتا ہے۔

لہٰذا ثابت ہوا کہ جب کسی بھی شے کو کسی عزت والی شے سے نسبت ہو جائے تو قابلِ احترام اور نسبت سے پہلے یا بعد یہ لازم نہیں کہ اس کی قدر و منزلت وہی ہو۔ روزمرہ کے مشاہدات اس پر دلالت کرتے ہیں۔ عام جانور کی وہ خاطر و پاس نہیں جو قربانی کے جانور کا ہوتا ہے۔

سال (۱۹۷۶ء) قائدِاعظمؒ کا سال تھا اور قوم ۲۵ دسمبر کو اس بطلِ جلیل کا صد سالہ جشن منا رہی تھی جو میرا ہی ہم مسلک تھا۔ قومی عجائب گھروں میں بابائے قوم کی تمام نشانیاں محفوظ کر لی گئی ہیں۔ مثلاً قائد کا طیارہ، کار، تلوار تحریریں اور ملبوسات وغیرہ۔ یہ حفاظت و نمائش کا اہتمام ثابت کرتا ہے کہ محترم ہستیوں کی نشانیاں بھی قابلِ احترام ہوتی ہیں۔ اگر کہا جائے کہ قائدِاعظم شیعہ تھے تو پھر ۱۹۷۷ء کو علامہ اقبالؒ کا سال قرار دیا گیا تھا اور حکیم الامت کی تمام نشانیاں بھی خصوصی طور پر محفوظ کر لی گئی ہیں۔

چوتھا سوال

سوال ۴:۔ بقول کلامِ الٰہی شہید ہمیشہ زندہ ہے اور زندہ کا ماتم چہ معنی؟

جواب ۴: پیشتر اس کے کہ سوال کا جواب دیا جائے یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ شہید کی تعریف کیا ہے اور اس کے متعلق شریعت کے احکام کیا ہیں۔ یاد رہے کہ شہید اسے کہتے ہیں جو راہِ خدا میں قتل ہو اور وہ مقتول جو راہِ خدا میں قتل نہیں ہوا شہید نہیں ہے۔ لیکن فرمانِ رسولؐ کے مطابق محبت اہل بیتؑ ایسی چیز ہے کہ اس پر رہ کر طبعی موت مرنے والا بھی شہید ہے کیونکہ محبتِ اہل بیتؑ راہِ حق ہے۔ دیکھیئے حدیث "من مات علیٰ حب آل محمد مات شہیداً" (صواعق محرقہ ابن حجر مکی امام اہل سنۃ والجماعۃ)

شہید کون ہے؟ شہادت کیسے نصیب ہوتی ہے؟ اس پر طویل روشنی ڈالی جاسکتی ہے جو فی الحال اصل مقصد کو طوالت میں پھینک دینا ہوگا۔ مختصراً عرض ہے کہ شہید بے شک زندہ ہے اور اسے رزق بھی ملتا ہے۔ مگر باوجود اس زندگی کے شریعت اسلامیہ کے بعض احکام شہید کے متعلق وہی ہیں جو مردہ کے لئے ہوتے ہیں۔ مثلاً تدفین یا ورثہ کے متعلق احکامات نیز شہید کی بیوہ کو نکاحِ ثانی کی اجازت وغیرہ۔ لہٰذا محض شہید کی زندگی عام کو پیشِ نظر رکھ کر ماتم کو غلط قرار دینا بے دلیل ہے۔ چونکہ شہید کی زندگی عام انسانی زندگی سے مختلف ہے اور اگر شہید کو زندہ سمجھتے ہوئے ماتم کو ناجائز

قرار دیا جائے تو پھر عام مسلمانوں سے یہ سوال ہوسکتا ہے کہ جب شہید زندہ ہے تو اس کی وراثت کیوں تقسیم ہوجاتی ہے؟ دوم یہ کہ اس کے زندہ ہوتے ہوئے اس کی بیوی کو بیوہ کیوں کہا جاتا ہے اور اسلام اسے دوسرے شخص سے نکاح کی اجازت کیوں دیتا ہے جب کہ پہلا شوہر زندہ جاوید ہے؟ پس معلوم ہوا کہ شہید کی حیات خاص ہے اور ماتم اس زندگی پر اثر انداز نہیں ہوتا ہے۔

شہید کے ماتم کے جواز میں ہم سب سے پہلے جنگ اُحد کا مندرجہ ذیل واقعہ جلیل القدر عالم اہل سنت شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی کتاب مدارج النبوت سے نقل کرتے ہیں:۔

"چوں ایں خبر بمدینہ رسید و فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا ایں آواز شنید دست بر سر زناں از خانہ بیروں دوید" یعنی جنگِ اُحد میں خبرِ شہادتِ رسولؐ سن کر جنابِ فاطمہؑ سر پیٹتی ہوئی گھر سے باہر آگئیں۔ (مدارج النبوۃ جلد ۲ صفحہ ۱۹۳)

اس اقتباس سے ثابت ہوجاتا ہے کہ جنابِ سیدہؑ بنت پیغمبرؐ شہید کے لئے رونا اور ماتم کرنا جائز سمجھتی تھیں ورنہ خبرِ شہادت پر ہرگز نہ پیٹتیں۔

اس کے علاوہ شہادت حضرت امیر حمزہؓ پر خود سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنے شہید چچا کا ماتم کیا جیسا کہ مولوی شبلی نعمانی نے اپنی کتاب سیرۃ النبیؐ میں تحریر کیا ہے اور حضورؐ کی نوحہ خوانی بر لاش حمزہؓ ہم آئندہ سوال کے جواب میں تحریر کریں گے۔

نیز یہ کہ حضرت رسول کریمؐ نے حضرت امام حسینؑ کی حیاتِ ظاہری میں محض خبرِ شہادت ہی پر گریہ فرمایا جیسا کہ ہم نے اوّل سوال کے جواب میں لکھا ہے ان تصریحات کی موجودگی میں یہ کہنا کہ زندہ کا ماتم جائز نہیں ہے خلافِ سنتِ رسولؐ ہے۔ جب کہ حضورؐ کے نزدیک شہید کی زندگی رونے سے مانع

نہیں ہے اور نہ ہی ماتم ہے۔

یہ بات اور بھی زیادہ تعجب انگیز ہے کہ آپ کے خیال کے مطابق نہ تو شہید (زندہ) کے لئے ماتم اور رونا جائز ہے اور نہ ہی مردہ کے لئے جیسا کہ آپ لوگ کہتے ہیں کہ "میت پر رونے سے میت پر عذاب ہوتا ہے" تو پھر فرمائیے کہ پیغمبر خدا اپنے فرزند ابراہیمؑ کے انتقال پر کیوں روئے؟ حمزہؓ کی شہادت پر کیوں رو کر بین کیا؟ آنحضرتؐ کا فعل آپ کے عقیدے کے بالکل برعکس ہے حضورؐ شہید پر بھی روئے اور میت پر بھی۔

زندہ کا ماتم بالکل جائز ہے اور قرآن مجید کے عین مطابق ہے قرآن میں حضرت یوسفؑ کا قصہ پڑھیئے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو باوجود اس علم کے کہ ان کے فرزند حضرت یوسفؑ زندہ ہیں پھر بھی غم جدائی میں اس قدر روئے کہ آنکھوں کی روشنی جاتی رہی۔ شاید بعض حضرات شبہ کریں کہ یعقوبؑ کے علم میں نہ تھا کہ یوسفؑ زندہ ہیں تو یہ شبہ خلاف قرآن ہے میرا تو ایمان یہ ہے کہ نبیؐ کو علم نبوت سے دُور کا بھی علم ہو سکتا ہے البتہ جو لوگ اس سے اختلاف کرتے ہیں ان کے لئے عرض ہے کہ جب حضرت یوسفؑ نے ستاروں والا خواب دیکھا اور جناب یعقوب علیہ السلام نے اس کی تعبیر ان کا نبی ظاہر ہونا فرمایا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت یعقوبؑ کو یہ یقینی علم تھا کہ یوسفؑ ضرور نبی ظاہر ہوں گے اور یعقوبؑ کو رضائے الٰہی میں کبھی شک نہ ہوا۔ برادران یوسفؑ کو بھی یہ قوی اندیشہ تھا کہ یوسفؑ نبی ہیں تب ہی تو ان کا حسد اور بڑھ گیا تھا۔ جب غیر نبی اشخاص کو قوی امید تھی تو یعقوبؑ کو بشارت الٰہی پر کیسے شک ہو سکتا ہے۔ یقیناً حضرت یعقوبؑ کا ایمان تھا کہ یوسفؑ منصب نبوت پر ظاہر ہوئے بغیر انتقال نہیں کر سکتے"

اسی لئے وہ فراق فرزند میں فرمایا کرتے تھے کہ مجھے یقین نہیں ہے کہ میرا بیٹا مر گیا ہو۔ اس بات پر قرآن مجید مزید روشنی ڈالتا ہے اور ثابت کرتا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام حضرت یوسفؑ کی موت پر یقین نہیں کرتے تھے جیسا کہ سورۂ یوسف کی آیت ۸۷ سے یہ بات ثابت ہے کہ انہوں نے اپنے بیٹوں کو یوسفؑ کی تلاش کا حکم دیا۔ یٰبَنِیَّ اذھبوا فتحسسوا من یوسف واخیہ۔ الخ۔ ترجمہ شیخ الہند محمود الحسن دیوبندی یہ کرتے ہیں

"اے بیٹو جاؤ اور تلاش کرو یوسفؑ کی اور اس کے بھائی کی"

یوسفؑ کے کرتے سے خون کی بو سونگھ کر فرمایا کہ یوسفؑ کی بو نہیں۔ بھیڑیوں سے دریافت کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ نبی کا خون ہم پر حرام ہے۔ ان باتوں سے یقیناً یہ ثابت ہے کہ حضرت یعقوبؑ کو حضرت یوسفؑ کی مبینہ موت کا مطلق اعتبار نہ تھا۔

اگر آپ یہ کہیں کہ موت کا علم ہونے پر روئے تو آپ کا یہ عقیدہ غلط ٹھہرا کہ میت پر رونے سے مردہ پر عذاب ہوتا ہے اور اگر کہیں کہ اللہ کے محبوب یا مظلوم بندوں پر نہیں ہوتا تو عرض ہے کہ حسینؑ بھی تو محبوب خدا اور مظلوم ہیں اور اگر جناب یوسفؑ کی موت کا یقین کر کے جناب یعقوبؑ روئے تو کیا وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ مردہ پر رونے سے مردہ پر عذاب ہوتا ہے اور اگر یعقوبؑ جانتے تھے تو کیا مانتے نہ تھے! مگر آپ تو زندہ یوسفؑ کی جدائی میں عزادار ہے۔ قرآن کتنی وضاحت سے اس واقعہ کو بیان کرتا ہے۔

اب معترضین یہ بتائیں کہ کیا خدا نے یعقوبؑ کے اس شدید رونے کو ناپسند کیا؟ اگر نہیں کیا تو پھر ہماری عزاداری آپ کی نظر میں بری بات کیوں ہے؟ یہ تو نبی کی سنت ہے کہ کسی کی جدائی میں اس کی محبت میں آنسو بہائے جائیں۔

پس از روئے قرآن مجید ثابت ہوا کہ کسی کی محبت میں رونا خواہ وہ زندہ ہو یا مردہ کوئی بُری بات نہیں ہے لہٰذا اگر شہید پر رونا جائز ہے تو پیٹنا اور واویلا بھی جائز ہے۔ دیکھئے جواب سوال نمبر ا۔

من گھڑت خیال

غیر شیعہ مسلمانوں کے ذہن میں یہ خیال سمایا ہوا ہے کہ اگر کوئی زندہ شخص کسی مُردے پر روئے تو مُردہ پر عذاب ہوتا ہے اور اس کے متعلق وہ عموماً یہ قول پیش کرتے ہیں۔

قال عمر ابن خطاب ان المیت لیعذب ببکاء الحی علیہ

یعنی حضرت عمر ابن خطاب نے فرمایا کہ اگر زندہ شخص میت پر روئے تو میت پر عذاب ہوتا ہے۔ اوّلاً تو زندہ کے رونے سے بجائے رونے والے کے مُردے بچارے پر عذاب کا ہونا عدلِ باری تعالیٰ کے منافی ہے اور اس قرآنی وعدہ کے خلاف ہے کہ کوئی کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ دوم ام المومنین حضرت عائشہ نے اس کی تردید فرمائی ہے۔

عن عمرۃ بنت عبدالرحمٰن انھا قالت سمعت عائشہ وذکر لھا ان عبداللہ بن عمر یقول ان المیت لیعذب ببکاء الحی علیہ تقول لیغفرہ بابی عبدالرحمٰن اما انہ لم یکذب ولکنہ نسی او اخطاء انما ھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یھودیۃ یبکی علیھا انھم لیبکون علیھا وانھا لتعذب فی قبرھا۔

ترجمہ:۔ (حضرت ابوبکر کی پوتی) عمرہ بنت عبدالرحمٰن کا بیان ہے کہ انہوں نے اپنی پھوپھی حضرت عائشہ کو کہتے ہوئے سُنا اس وقت جب ان سے کہا گیا کہ عبداللہ بن عمر کہتے ہیں کہ زندوں کے رونے سے مُردوں پر عذاب ہوتا ہے تو حضرت عائشہ نے فرمایا خدا ان کی مغفرت کرے انہوں نے غلط

جھوٹ نہیں بولا۔ وہ بھول گئے یا سمجھنے میں خطا کی۔ حقیقت صرف اتنی ہے کہ رسول اللہ ایک طرف سے گذرے جہاں لوگ ایک یہودی عورت کو رو رہے تھے تو آپ نے ارشاد فرمایا "یہ لوگ رو رہے ہیں حالانکہ اس پر قبر میں عذاب ہو رہا ہے"۔ (یعنی صاف ظاہر ہے کہ اگر حضورؐ نے یہ فرمایا تھا تو غیر مسلموں کے لئے نہ کہ اہل اسلام کے لئے)۔

(روایت اہل سنت متفق علیہ مشکوٰۃ المصابیح باب البکا علی المیت)

یرحم اللہ عمر واللہ ما حدث رسول اللہ صلعم ان المیت لیعذب ببکاء الحی علیہ ولکن اللہ یزید الکافر عذابا ببکاء اھلہ علیہ وقال عائشہ حسبکم القرآن۔ الخ

ترجمہ:۔ خدا عمر پر رحم کرے خدا کی قسم رسول اللہ صلعم نے کبھی نہیں فرمایا کہ زندوں کے رونے سے مُردوں پر عذاب ہوتا ہے بلکہ یہ فرمایا تھا کہ خدا کافروں کے عذاب میں اضافہ کر دیتا ہے جب اس کے متعلقین اس پر روتے ہیں۔ پھر عائشہ نے فرمایا کہ تمہارے لئے تو قرآن کافی ہے یہ آیت یاد کرو کہ کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔

(روایت اہل سنت مشکوٰۃ المصابیح باب البکا علی المیت)

پس دونوں روایات سے یہی بات ثابت ہوئی کہ حضورؐ نے میت پر رونے سے منع نہیں فرمایا بلکہ ارشاد کیا کہ کفار کے لواحقین کے رونے سے اس کافر میت پر عذاب میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ نہ مسلمان یا شہید کے لئے۔ پس ایسا خیال من گھڑت اور غلط ہے کہ زندوں کے رونے سے مُردوں پر عذاب ہوتا ہے۔

اسی طرح کتب اہل سنت میں مندرجہ ذیل روایت بھی قابل غور ہے۔

عن ابی ھریرہ قال مات میت من آل رسول اللہ فاجتمع النساء یبکین علیہ فقام عمر ینھٰھن ویطردھن فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعھن یا عمر فان العین دامعۃ والقلب مصاب والعھد قریب ۔ رواہ احمد والنسائی۔

(روایت اہل سنت مشکوٰۃ المصابیح باب البکا علی المیت)

یعنی ابوہریرہ سے مروی ہے کہ آل رسول صلعم میں کسی کا انتقال ہوا پس عورتیں جمع ہوکر اس پر رونے لگیں۔ حضرت عمرؓ اُٹھے اور انہیں منع کرنے لگے اور بھگانے لگے۔ پس رسول اللہؐ نے فرمایا اے عمر! ان کو چھوڑ دو کیونکہ آنکھ رو رہی ہے۔ دل مصیبت زدہ ہے اور عہد قریب ہے۔ اس روایت کو احمد اور نسائی نے بیان کیا ہے۔

پس ثابت ہوا کہ رونا سنتِ نبویؐ ہے اور اسے روکنا طریقِ عمر۔ آپ کو اختیار ہے سنتِ محمدی اور طریقۂ عمر میں سے جسے چاہیں ترجیح کے لائق سمجھیں۔! اگر زندہ شہید کو دفن کرسکتے ہیں تو عزاداری بھی ہو سکتی ہے ورنہ زندہ کی قبر اور فاتحہ چہ معنی دارد؟

اس کے علاوہ کئی روایات جن میں سے چند ایک ہم نے بطورِ ثبوت پیش کی ہیں دلالت کرتی ہیں کہ خود حضورؐ امام حسینؑ امام حسنؑ کی بے کسی اور شہادت پر روتے رہے جب کہ حسنؑ اور حسینؑ دونوں بظاہر زندہ و موجود تھے۔ نیز حضرت علیؑ اور دیگر صحابہ کرام نے بھی یہی عمل کیا لہٰذا صاف ظاہر ہے کہ زندہ پر رونے کا اعتراض کرنے والے ہم پر نہیں بلکہ بالواسطہ انبیاءؑ اصحاب رسولؐ، ازواجِ پیغمبرؐ اور خود رسالت مآبؐ پر معترض ہیں۔ خدارا قرآن و احادیث کے مطابق انصاف کیجیے۔

پانچواں سوال

سوال نمبر ۵ اسمائے مقدسہ کی تشہیر سرِعام کرنا، مرثیہ اور نوحہ خوانی میں مخدرات کے نام لینا کیونکر جائز ہے؟ کیا یہ بے حرمتی نہیں ہے؟

جواب نمبر ۵ ۔ ایسا اعتراض کرنے والوں کو سب سے پہلے اپنے گریبان میں ضرور جھانک لینا چاہیئے کیونکہ اس فعل کا ارتکاب وہ ہم سے کہیں زیادہ کرتے ہیں۔ ہر روز نعت خوانی کرتے ہوئے، مزاروں پر قوالیاں کرتے ہوئے اور محافل سماع منعقد کراتے ہوئے وہ اکثر و بیشتر مقدس ناموں کی تشہیر کرتے ہیں۔ رمضان شریف کی راتوں میں سحری کے وقت لوگ بازاروں میں نعتیں پڑھ پڑھ کر لوگوں کو جگاتے ہیں۔ مزارات پر عرس وغیرہ کے مواقع پر عموماً سہرے جلوس بنا کر لے جائے جاتے ہیں اور لاؤڈ سپیکروں پر نعت خوانی ہوتی ہے۔ اور تمام موقعوں پر سلام ضرور پیش کیا جاتا ہے جس میں رسول مقبولؐ کی والدہ ماجدہ حضرت آمنہؑ کا مقدس نام لیا جاتا ہے۔

عید میلاد النبیؐ کے موقع پر جلوس کی شکل میں لاؤڈ سپیکروں پر مقدس ناموں کی تشہیر ہوتی ہے۔ آخری چہار شنبہ اور بڑی گیارہویں شریف پر بھی اس کام میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا جاتا ہے۔ مگر معلوم نہیں اگر یہی کام شیعہ بچارے کرلیتے ہیں تو پھر انہیں نشانہ اعتراض کیوں بنایا جاتا ہے؟ کیا جو

قوالیاں گائی اور نعتیں پڑھی جاتی ہیں ان میں قابلِ احترام نام نہیں ہوتے ؟
ان میں بھی تو آپ بلند آواز میں پڑھتے ہیں۔

سلام اے آمنہ کے لال اے محبوبِ سبحانی
اے آمنہ کے لال تم پہ لاکھوں سلام

میلاد کے اجتماعات میں بی بی حلیمہ سعدیہؓ کا نام بھی بار بار لیا جاتا ہے۔
اور اسی طرح کئی دیگر مخدرات کے اسمائے گرامی کی تشہیر آپ کرتے ہیں۔ پھر
آپ ہم پر کس منہ سے اعتراض کر سکتے ہیں ؟

لوگ ہم پر بڑے فخر سے طنزیہ سوال کرتے ہیں کہ اگر تمہاری ماں بہن کا
نام کوئی بازار میں لے تو تم اسے محسوس نہ کرو گے ؟ اس جاہلانہ اعتراض کا
جواب دینے سے قبل میں ان سے پوچھتا ہوں کہ نکاح کے وقت جب نامحرم
لوگوں کی موجودگی میں نکاح خواں کسی کی بیٹی یا بہن کا نام لے کر کہتا ہے کہ
فلاں بنت فلاں سے نکاح قبول تو بے حرمتی کیوں نہیں؟ خواہ نکاح گھر
کی چار دیواری میں کیوں نہ ہو لیکن رشتہ داروں کے علاوہ احباب بھی
ہوتے ہیں اور برسرِ عام تمام لوگوں کی موجودگی میں بلند آواز سے لڑکی کا
نام لیا جاتا ہے مگر اس وقت اس نام لینے کو کوئی شخص بھی بے حرمتی نہیں
سمجھتا ہے کیونکہ معلوم ہوتا ہے کہ محض نام پکارنے سے کسی بی بی کی بے حرمتی نہیں
ہے۔ جب تک کہ نام لینے والے کا مقصد نام پکارنے سے بے عزتی نہ ہو۔ خواہ بازار ہو
یا گھر کی چار دیواری ہو۔ سوال تو محض اجنبی و نامحرم کی موجودگی میں نام لینے
کا ہے نہ کہ سڑکوں اور مکانوں کے پتھروں کی موجودگی کا۔

تہذیب ہائے زمانہ میں کسی بھی مکتبِ فکر کے حامی لوگوں میں کسی بی بی کا نام
بطور ذکرِ خیر و عظمت لینا معیوب نہیں ہے۔ مذہب عیسائی میں بی بی مریمؑ کا نام

لوگوں کی موجودگی میں لینا منع نہیں ہے۔ اہل ہنود میں سیتا کا نام لینا ممنوع نہیں
اسی طرح مسلمانوں میں عام لوگوں کے سامنے باآوازِ بلند قرآن مجید کی ان آیات
کی تلاوت کرنا منع نہیں ہے جن میں بی بی مریمؑ جیسی باعصمت و صدیقہ خاتون کا
نام صریحاً موجود ہے۔ حتیٰ کہ پ۲۸ سورہ تحریم میں بی بی صاحبہ کے متعلق یہاں
تک خدا نے فرمایا ہے کہ "و مریم بنت عمران التی احصنت فرجھا"
یعنی حضرت مریمؑ بنت عمران اپنی شرمگاہ کی حفاظت کرنے والی تھیں۔ علماء
اسلام اور حفاظ قرآن تلاوت کے وقت یہ آیت بھی لاؤڈ سپیکروں پر
پڑھتے ہیں لیکن کبھی کسی نے نہیں کہا ہے کہ معاذ اللہ یہ بی بی صاحبہ کی توہین ہے۔

اس طرح واعظین عموماً کئی مخدرات کے نام مجمع عام میں دہراتے ہیں
آواز گلی گلی کوچہ کوچہ میں گونجتی ہے۔ احادیث پڑھتے ہوئے "عن عائشۃ"
کہہ کر عموماً زوجۂ رسولؐ ام المومنین بی بی عائشہؓ کا نام بار بار دہرایا جاتا ہے
حج و قربانی کے واقعات میں بی بی حاجرہؑ کا نام ضرور لیا جاتا ہے۔ تو کیا معاذ اللہ
سرِ عام نام لئے جانے اور سُنے جانے پر ابراہیمؑ، علیؑ اور سرکارِ رسالتؐ، خدا پر
اعتراض کریں گے کہ ہماری ماؤں بہنوں اور بیٹیوں کے نام جو قرآن و احادیث
میں ہیں بازاروں میں کیوں لئے جا رہے ہیں؟ تو پھر خود ہی سوچ کر جواب
دیجئے کہ تلاوت اور وعظ کا کیا بنے گا جبکہ دوسری طرف یہ کہا جاتا ہے کہ
قرآن مجید کا ایک لفظ "مریم" کہیں تو چالیس نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔ اب انصاف
کیجئے کہ ابراہیمؑ و عیسیٰؑ کے خاندان کی مقدس بی بی کا نام لینا باعثِ برکت ہے تو
محمد مصطفےٰؐ کی بیٹیوں کی فضیلت یا مصیبت فی سبیل اللہ کا ذکر کرنا کیوں
ناجائز سمجھا جائے ؟

مسلمانوں کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ روزِ قیامت ہر شخص اپنی اپنی ماں کے

نام سے پکارا جائے گا جب کہ خدا کی طرف سے منادی میدانِ حشر میں مجمع عام کے سامنے ہماری ماؤں بہنوں بیٹیوں کے نام پکارے گا تو کیا وہ معاذ اللہ بے حرمتی ہوگی؟

معلوم نہیں کس بے بنیاد اساس پر راہِ خدا میں قربانی دینے والی پاک بیبیوں کے نام ذکرِ قربانی کرتے ہوئے لینے کو لوگ بے حرمتی خیال کرتے ہیں۔ حالانکہ قربانیٔ اسمٰعیلؑ کے ذکر میں علماء بی بی ہاجرہؑ کا نام جلسوں میں پکارتے ہوئے اس غلط خیال کا احساس نہیں کرتے۔

اہل سنۃ والجماعت کے علماء عام جلسوں میں انبوہ کثیر کی موجودگی میں اپنے امام اعظم کی کنیت "ابوحنیفہ" بولتے ہیں تو اس میں ان امام صاحب کی صاحب زادی کا نام "حنیفہ" آتا ہے۔ کیونکہ ابوحنیفہ کا مطلب ہے حنیفہ کا باپ۔ تو بتایئے کیا نعمان بن ثابت کا ذکر "ابوحنیفہ" کہہ کر عام لوگوں میں کرنا امام اعظم کی توہین ہے یا نہیں؟ اور فرمایئے کیا زلیخا جناب یوسفؑ کی زوجہ تھیں یا نہیں؟ کیا یوسفؑ زلیخا کا قصہ لوگوں کے سامنے بیان کیا جاتا ہے یا نہیں؟ حضرت سلیمانؑ کی زوجہ بلقیس کا تذکرہ بھی کیا جاتا ہے۔

ازواجِ رسولؐ کی فضیلت میں کئی روایات احادیث کی کتابوں میں ہیں جن کو اصحاب کے سامنے خود حضورؐ نے بیان کیا؟ اسی طرح اہل بیت طاہرینؑ کے مناقب میں سیدہ طاہرہؑ بی بی پاک بتولؑ کی شان میں کئی فضائل حضورؐ نے صحابہ کے سامنے ارشاد فرمائے اور انہوں نے پھر آگے روایت کئے۔ اگر بیبیوں کا نام لینا معیوب ہوتا تو قرآن و احادیث میں مخدراتِ عصمت کے تذکرے ہی موجود نہ ہوتے۔

دراصل یہ بنی امیہ کے پیروکاروں کا صرف ایک بہانہ ہے جس کا

مقصد یہ ہے کہ مظالم چھپے رہیں یا تبلیغ مذہب آلِ محمدؐ کو روکا جائے لیکن اس ذکر کو جتنا دبایا گیا یہ اتنا ہی ابھرتا چلا گیا۔ اور زمانہ دیکھ رہا ہے کہ آلِ محمدؐ کے پیروکاروں میں دن دگنی رات چوگنی ترقی نظر آتی ہے۔ یہ سب ان اسمائے مبارکہ کی برکت ہے۔

اب آیئے دیکھتے ہیں کہ نوحہ خوانی اور مرثیہ گوئی کے متعلق سرکارِ رسالتؐ کا نظریہ و عمل کیا ہے؟ چنانچہ مشہور صحابی رسولؐ قاری حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت امیر حمزہ شہیدؓ کی لاش مبارک پر سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس طرح نوحہ خوانی و گریہ و بکا کیا۔

"یا حمزہ یا عم رسول اللہ۔ یا اسد اللہ و اسد رسولہ یا حمزہ یا فاعل الخیرات یا حمزہ یا کاشف الکربات۔ یا حمزہ ذاب عن وجہ رسول اللہ۔ (مدارج النبوۃ جلد ۲ صفحہ ۵۶۶)

اے حمزہ۔ اے اللہ کے رسول کے چچا! اے خدا کے شیر اور اس کے رسول کے شیر! اے حمزہ! اے فاعل خیرات! اے حمزہ! اے مصیبتوں کو دور کرنے والے۔ اے حمزہ! رسول سے کرب و مصیبت کے ہٹانے والے۔ (خدارا انصاف کیجئے یہ بین ہے یا نہیں؟)

صاف ظاہر ہے کہ شہید کو پکار کر بین کرنا سنتِ نبویؐ ہے۔

حضرت علیؑ اور امام زین العابدینؑ کے نوحے و مرثیہ جات مشہور ہیں جناب زینبؑ و ام کلثومؑ کے متعدد نوحہ جات کتب میں ملتے ہیں اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے اپنی تصنیف "سر الشہادتین" میں حضرت امام حسین علیہ السلام پر جنات کا نوحہ پڑھنا بیان کیا ہے۔

اگر کوئی یہ کہے کہ حضورؐ نے تکمیل شریعت سے پہلے یہ نوحہ خوانی فرمائی اور اس حوالہ میں کسی بی بی کا نام موجود نہیں ہے تو ایسے معترض کے لیے ہم امام المتقین امیرالمومنین علی ابن ابی طالبؑ کی نوحہ خوانی و گریہ زاری حضور سردار الانبیاء صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم بطورِ ثبوت پیش کرتے ہیں جس میں حضرت امیر علیہ السلام نے جناب سیدۃ النساء حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کی وفات پر اظہار غم یوں فرمایا:-

"آپؐ پر سلام ہو اے اللہ کے رسولؐ! میرے اور اپنی اس بیٹی کی طرف سے سلام قبول فرمایئے۔ آپ کی یہ بیٹی جو آپؐ کے جوار میں آ گئی ہے اور بہت جلد آپؐ سے آملی ہے اے رسولِ خداؐ! فاطمہؑ کی وفات سے میرے صبر کا امتحان لیا گیا ہے۔ ان کی جدائی سے میری طاقت صبر جواب دے رہی ہے اس حالتِ مصیبت میں بھی میرے صبر کے لئے یہ کافی ہے کہ میں نے آپؐ کی جدائی پر صبر سے کام لیا۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے آپ کو لحد میں اتارا۔ میرے ہی حلقوم و گلے کے درمیان آپ کی جان تن سے جدا ہوئی۔ ہر چیز اللہ کی ہے اور اس کی طرف لوٹ جانے والی ہے۔ آپ کی بیٹی ایک ودیعت تھی جو واپس لے لی گئی۔ یہ ایک نشانی تھی جو اٹھالی گئی۔ اب میرا حزن و ملال دائمی ہے۔ اب میرے لئے آرام کی نیند کہاں؟ جب تک خدائے عالم میرے لیے اس مقام (آخرت) کا ارادہ کرے جہاں آپ مقیم ہیں۔

عنقریب آپؐ کی صاحبزادی آپ کو آگاہ کریں گی۔ آپؐ ان سے اچھی طرح معلوم کیجیئے۔ آپؐ میرے حالات کو ان سے دریافت کیجیئے۔ حالانکہ آپؐ کی وفات کو کوئی زیادہ مدت نہیں گذری اور زمانہ آپؐ کی یاد سے غافل نہیں ہوا آپ پر اور آپؐ کی دختر پر اس طرح سلام پہنچے جیسے کوئی دوست سلامِ محبت

پیش کرتا ہے۔ دل تنگ، چشمگیں اور رنجیدہ ہو کر نہیں۔ پس اگر میں یہاں سے واپس جاؤں تو یہ بے تعلقی کی وجہ سے نہیں ہو گا (بلکہ حقوق و فرائض کی ادائیگی کے لیے ہو گا) اور اگر آپؐ کی زیارت کے لئے ٹھہرا رہوں تو یہ اس اجر کے متعلق بدگمانی کے سبب نہ ہو گا۔ جس کا خدا تعالیٰ نے صابرین سے وعدہ فرمایا ہے۔" (یعنی مجھے یہ بدگمانی نہیں ہے کہ اگر میں زیادہ دیر ٹھہرا تو اللہ اور اس کے رسولؐ مجھے اجرِ زیارت سے محروم کر دیں گے بلکہ مجھے ہر حال میں یقین ہے کہ اجرِ زیارتِ قبرِ رسولؐ و قبرِ بتولؑ ضرور ملے گا) (سیدہ فاطمۃ الزہراؑ)

امیرالمومنینؑ کے یہ کلمات (نوحہ خوانی و مرثیہ گوئی) ثابت کرتے ہیں کہ آپؑ نہ ہی مرثیہ و نوحہ خوانی کو خلافِ شریعت سمجھتے تھے اور نہ ہی محذرات کا ذکرِ خیر کرنا معیوب خیال فرماتے تھے۔ نیز یہ کہ آپؑ حضورؐ کو حاضر سمجھتے ہوئے ان کی بارگاہ میں اپنے رنج کا اظہار فرما رہے تھے۔ اور اسے صبر کے خلاف نہیں جانتے تھے۔

کسی کی مظلومیت کا ذکرِ خیر مشہور کرنا گناہ نہیں ہے ورنہ قرآنِ مجید میں انبیاءؑ و صالحین کی مظلومیت کے قصّے بیان نہ کیے جاتے۔ دورِ حاضرہ میں جب کسی کو ذرا سی تکلیف ہو تو اخبارات سیاہ حاشیوں سے کالے کر دیئے جاتے ہیں۔ جلسے و جلوسوں کا اہتمام کر کے احتجاج کیئے جاتے ہیں تاکہ تکلیف عیاں ہو جائے۔ دنیا مظالم سے واقف ہو جائے مگر افسوس ہے کہ حسینؑ کے مصائب کی تشہیر کی جائے تو اسے عیب سمجھا جاتا ہے۔ شاید اس لئے کہ ڈھول کا پول کھلنے کا اندیشہ ہے۔ نوحہ خوانی وغیرہ کے مزید اثبات مندرجہ ذیل کتب اہل سنت میں ملاحظہ کیجیے۔

تاریخ ابو الفدا۔ مدارج النبوۃ۔ تاریخ کامل ابن اثیر وغیرہ۔

چھٹا سوال

سوال ۶: شیعہ لوگ ہی قاتلانِ سادات تھے اور امام کی بددعا کا نتیجہ ہے کہ روپیٹ رہے ہیں اور اب اپنے بزرگوں کے کیے ہوئے افعال کی توبہ کرتے ہیں۔ کیا حقیقت یہی ہے؟

جواب ۶: کچھ لوگ تہمت لگاتے ہیں کہ شیعہ لوگ وہی ہیں جنہوں نے کوفہ سے پے در پے خطوط اور دعوت نامے لکھے لیکن امام کو بروقت دھوکہ دیا اور قتل کیا۔ اس بے بنیاد الزام کے جواب میں ہماری طرف سے کئی کتب تحریر کی گئی ہیں۔ مثلاً امامیہ مشن لاہور نے دو کتابیں شائع کی ہیں "قاتلانِ حسینؑ کا مذہب" مصنفہ سید علی نقی صاحب قبلہ اور "اہل کوفہ و تشیع" مرتبہ خان بہادر محمد عباس زیدی صاحب لہٰذا مفصل جواب کے لئے مذکورہ کتب کا مطالعہ فرمائیے مختصراً عرض ہے کہ۔۔۔

"معجم البلدان" حموی مطبوعہ مصر اور "الفاروق" جلد ۲ صفحہ ۸۵ میں علامہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں کہ کوفہ شہر ۱۷ھ میں حضرت عمر نے آباد کیا۔ اسے ایک فوجی چھاؤنی بنایا۔ خالص عرب نسل کے لوگ وہاں آباد تھے اور ان کو وظائف دیے کوفیوں کو حضرت عمر بہت پسند فرماتے تھے۔ اسی لیے حضرت عمر نے اہلِ کوفہ کو خط لکھا۔

"اے اہلِ کوفہ! تم عرب کے سر اور دماغ ہو اور تم میرے وہ تیر ہو جن سے میں دوسروں کو نشانہ بناتا ہوں۔" (طبقات ابن سعد کاتب واقدی جلد ۶ صفحہ ۳) کوئی بھی تاریخ دیکھ لیجئے معلوم ہو گا کہ اہل کوفہ کی اکثریت حضرت علیؑ

کو خلیفہ چہارم تسلیم کرتی تھی جو کہ شیعہ عقیدہ نہیں ہے جب کہ اہلِ شیعہ جناب امیرؑ کو خلیفہ بلافصل مانتے ہیں۔ تاریخ طبری جلد ۵ صفحہ ۱۸۹ سطر ۱۹ مطبوعہ مصر سے معلوم ہوتا ہے کہ مالک اشترؒ نے حضرت عثمان کے خلاف کچھ کہا تو اہل کوفہ ان کے خلاف ہو گئے۔ ہمیں کسی معتبر تاریخ میں یہ بات نظر نہیں آتی ہے کہ کوفے میں علی کے شیعوں کی اکثریت تھی بلکہ تاریخ میں بالوضاحت مرقوم ہے کہ کوفہ شہر میں اکثریت حامیانِ عثمان کی تھی۔ اور اس شہر کا یہ حال تھا کہ ہر جگہ علیؑ اور اولادِ علی کو علانیہ گالیاں دی جاتی تھیں۔ ملاحظہ کیجیے طبری جلد ۶ صفحہ ۱۴۱ مطبوعہ مصر۔

جب زیاد بن سمیہ گورنر کوفہ ہوا تو اس نے تمام شیعانِ علیؑ کو قتل کیا۔ یہاں تک کہ شیعت بالکل آٹے میں نمک نظر آنے لگی۔

دیکھیے البدایہ والنہایہ جلد ۳ صفحہ ۵، تاریخ کامل ابن اثیر جلد ۳ صفحہ ۲۴۵ نصائح کافیہ صفحہ ۷، استیعاب جلد ۱ صفحہ ۱۳۸ اور طبری جلد ۶ صفحہ ۱۵۵۔

مندرجہ بالا حوالہ جات کو دیکھنے سے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ عہد معاویہ میں علیؑ کے طرفداروں سے کیا سلوک کیا گیا۔ یہاں تک کہ ابن زیادِ لعین جب کوفہ کا حاکم مقرر ہوا تو اس نے ہانی بن عروہؒ سے (جو شیعہ تھے) یہ کہا:۔

یا ھانی اما تعلم ان ابی قدم ھذا البلد فلم یترک احدا من ھذا الشیعۃ الا قتلہ غیر ابیک و حجر و کان حجر ما قد علمت۔

(طبری مطبوعہ مصر جلد ۶ صفحہ ۲۰۲ تاریخ طبری فارسی مطبوعہ نولکشور لکھنؤ)

ترجمہ:۔ اے ہانی! کیا تم نہیں جانتے، جب ہمارا باپ حاکم ہو کر آیا تھا تو شیعہ اس کے یہاں ایک بھی نہیں چھوڑا تھا سوائے تمہارے باپ اور حجر (ابن عدی بن حاتم طائی) کے اور پھر حجر بن عدی کا جو حال کیا گیا وہ بھی تم جانتے ہو۔

اندریں حالات کوفہ میں شیعہ اکثریت میں باقی کیسے رہ سکتے تھے؟ تاریخ سے پوری طرح ثابت ہے کہ کوفہ میں شیعوں کی اکثریت قطعاً نہ تھی عوام اہل کوفہ جو کہ اہل سنت کے اعتقاد کے مطابق اصحاب ثلاثہ کو بھی خلفاء رسولؐ سمجھتے تھے انہوں نے حکومت کی سختیوں اور نامعقول پالیسیوں سے عاجز آکر اور حاکموں کی سختیوں اور نارواء مظالم سے تنگ آکر امام حسینؑ کو خطوط لکھے تھے ان خطوط نویسیوں میں ہر عقیدہ کے عوام و خواص شامل تھے۔ چونکہ شیعوں کو چن چن کر ختم کر دیا گیا تھا لہٰذا اتنا سب آبادی کے لحاظ سے ان دعوت دینے والے کوفیوں کی تعداد نمایاں طور پر غالب تھی جن کا مذہب شیعہ نہ تھا البتہ چند لوگ شیعہ ضرور ہوں گے جو موت کے منہ سے بچ نکلے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت امام حسینؑ کوفہ کی طرف روانہ ہونے لگے تو حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت محمد حنفیہ جیسے بزرگوں نے خدمت امامؑ میں گزارش کی کہ وہ کوفہ کی بجائے یمن چلے جائیں کیونکہ یمن میں شیعان علیؑ کی اکثریت ہے کوفہ میں شیعہ اکثریت نہ تھی بلکہ زیادہ تر لوگ حضرت امیر علیہ السلام کے خلاف تھے۔ ہاں البتہ چند لوگ شیعہ ضرور تھے جو انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں اور انہوں نے اپنی وفا کو دھبہ نہیں لگنے دیا۔ مثلاً حضرات ہانی بن عروہ، محمد بن کثیر، قیس بن مظہر صیداوی وغیرہ۔ المختصر تاریخ سے یہ بات مکمل طور پر ثابت ہے کہ اکثر کوفی لوگ غیر شیعہ تھے۔

جن لوگوں نے امام حسینؑ کو ظلم و جور کے ساتھ شہید کرنے میں حصہ لیا ان میں کئی صحابی اور صحابہ کے بیٹے تھے مثلاً عمر بن سعد۔ اہل سنت کے عشرہ مبشرہ میں سے سعد بن ابی وقاص صحابی کا بیٹا تھا اور واقعہ کربلا میں لشکر یزید لعین کا سردار تھا۔ حضرت عمر کے زمانہ میں اسے حمص کا گورنر مقرر کیا گیا تھا۔ حضرت صاحب اس کی بہت عزت کیا کرتے تھے۔ اب ظاہر ہے کہ جس خلیفہ نے ابن سعد کو گورنر مقرر کیا وہ اسے خلیفہ مقرر مانتا تھا تبھی تو خلیفہ صاحب اسے معزز سمجھتے تھے جب کہ

شیعہ حضرت علیؑ کو خلیفہ بلافصل مانتے ہیں پس ثابت ہوا کہ عمر بن سعد شیعہ نہ تھا بلکہ ممدوح و معتقد حضرت ثانی تھا۔

محمد بن اشعث۔ یہ ملعون حضرت ابوبکر کا حقیقی بھانجہ تھا۔ اس کی بہن جعدہ بنت اشعث نے امام حسنؑ کو زہر دیا تھا۔

علی بن قرظ انصاری اور ثمرہ بن جندب وغیرہ وغیرہ۔

اسی طرح قاتل امام حسینؑ شمر بن ذوالجوشن لعین کو مذہب شیعہ میں ملعون و مردود سمجھا جاتا ہے۔ اس پر لعنت کرنا اجر عظیم کا باعث اعتقاد کیا جاتا ہے مگر ایسے شقی القلب کو حسن کے بارے میں حدیث رسولؐ ہے کہ میرے حسینؑ کا قاتل ڈبا کتا ہوگا (ملاحظہ فرمائیں طبقات ابن سعد، طبرانی شریف، خصائص کبریٰ، ما ثبت بالسنۃ اور سر الشہادتین صفحہ وغیرہ) مذہب اہل سنت کے سب سے بڑے محدث امام بخاری نے اپنی کتاب صحیح بخاری میں اس سے روایت لے کر اپنی محبت کا ثبوت دیا ہے۔ اگر شمر لعین شیعہ ہوتا تو پھر امام بخاری صاحب اس سے روایت کیوں لیتے اور اسے معتبر کیوں سمجھتے۔ پس اب خود ہی اندازہ کر لیجئے کہ قاتل امام مظلوم کس مذہب کا راوی تھا اور بخاری بعد از کلام باری کا درجہ کس مذہب میں سمجھا جاتا ہے۔

عبیداللہ بن زیاد کا مذہب یہ تھا وہ حضرت عثمان کو خلیفہ رسولؐ مانتا تھا اور ان کو تقی، زکی، مظلوم اور امیر المومنین اعتقاد کرتا تھا۔ جب کہ مذہب شیعہ کا یہ عقیدہ نہیں ہے۔ علامہ اہل سنت ابن جریر طبری اپنی تاریخ الرسل والملوک میں اس طرح لکھتے ہیں:-

"عبیداللہ بن زیاد کی جانب سے عمر بن سعد کے پاس تحریری حکم پہنچا کہ اما بعد حسینؑ و اصحاب حسینؑ اور پانی کے درمیان حائل ہو اور وہ اس میں سے ایک قطرہ بھی نہ پینے پائیں جیسا کہ تقی، زکی، مظلوم امیر المومنین عثمان بن عفان سے کیا گیا تھا۔"

(کتاب مذکورہ مع فرانسیسی ترجمہ جلد نمبر ۲ صفحہ ۲۱۲ و صفحہ ۳۱۲ مطبوعہ ای جے برل)

مذہب امامیہ کی رُو سے حضرت علیؑ کے سوائے کوئی بھی امیر المومنین نہیں۔
حتی کہ ائمہ طاہرینؑ میں سے بھی ہم کسی کو امیر المومنین نہیں لکھتے ہیں۔ لیکن فوج یزیدِ لعین نے جنگِ کربلا میں حصہ لیا یزیدؒ کو امیر المومنین کہتی تھی جو کہ عقیدہ شیعہ کے خلاف ہے۔ بعض لوگ حضرت امیر المومنینؑ کے کوفہ کو دار السلطنت بنانے کو دلیل سمجھتے ہیں کہ کوفہ میں شیعوں کی کثرت تھی لیکن اس پر ہم پوچھتے ہیں کہ بتایئے جناب امیر مذہب امامیہ کی تبلیغ فرماتے تھے یا نہیں؟ اگر کہا جائے "ہاں" تو ثابت ہوا کہ مذہب امامیہ حق ہے کہ علیؑ نے اس کو پھیلایا اور اگر کہا جائے کہ "نہیں" تو پھر یہ کیسی عجیب بات ہے کہ تبلیغ تو دوسرے مذہب کی ہو اور پھیلے مذہب شیعہ۔ پس دونوں صورتیں یہ ثابت نہیں کرتی ہیں کہ کوفہ والے شیعہ تھے۔ اور اگر بالفرض محال یہ مان لیا جائے کہ کوفہ میں شیعہ زیادہ تھے تو بھی زیاد اور ابن زیاد کی شیعہ کشی سے ثابت ہو جاتا ہے کہ شیعت کو اس شہر میں نیست و نابود کرنے کے لئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا گیا۔

جہاں تک توابین کے اقدام انتقام اور اس سلسلہ میں اپنی جانوں کو قربان کرنے کا تعلق ہے وہ ان لوگوں کی نیک نیتی کی دلیل ہے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ کوئی شخص یہ ثابت نہیں کر سکتا ہے کہ توابین میں کا ایک شخص بھی واقعہ کربلا میں امام کے خلاف لڑا ہو۔ ذرا غور فرمایئے کہ اگر وہ قاتل خود ہی تھے تو پھر انتقام کس سے لے رہے تھے۔

اگر فرض کر لیا جائے کہ کسی ظالم شخص کو ظلم کر لینے کے بعد احساس ظلم ہو سکتا ہے اور توبہ کا دروازہ کسی کے لئے بند نہیں ہے تو بھی یہ کہیں سے ثابت نہ ہو سکے گا کہ انہوں نے رونا پیٹنا شروع کر دیا تھا۔ حالانکہ اگر ایسا ہو تب بھی مذہب امامیہ کے لئے مضر رساں نہیں کیونکہ ندامت و پشیمانی اور توبہ مذموم افعال نہیں ہیں اور ایسا ہو جانا بھی اس بات ہی کا ثبوت ہوگا کہ

مذہب شیعہ حق تھا اور اس کا غیر باطل تبھی تو باطل کو چھوڑ کر حق شناسی کی طرف آنا پڑا۔ عجب کہ یہ بات کسی مستند حوالہ سے ثابت نہیں ہے کہ قاتلانِ حسینؑ نے رونا پیٹنا شروع کر دیا تھا۔ حالانکہ ہم نے گذشتہ اوراق میں مفصل طور پر ثابت کر دیا ہے کہ عزاداری سنتِ رسولؐ، سنت ائمہ طاہرینؑ اور سنت انبیاء کرامؑ ہے۔

لوگ کہتے ہیں جن سے ہتھیار اور نشانیاں برآمد ہوں قانون کی نظر میں وہی مجرم ہوتے ہیں اور ثبوت میں حضرت یوسفؑ کے بھائیوں کا واقعہ سناتے ہیں جن سے کرتہ ملا اور وہ رونے لگے۔ اسی بنیاد پر وہ ہماری عزاداری اور زیارات نکالنے پر معترض ہیں۔

اس اعتراض سے کھلا مطلب یہ ہوا کہ تمام عیسائی جو حضرت عیسیٰؑ کے مصلوب ہونے پر اعتقاد رکھتے ہیں اور صلیب کو اپنا خاص نشان سمجھتے ہیں۔ معترض ان سب عیسائیوں پر حضرت عیسیٰؑ کو صلیب دینے کا الزام لگا رہے ہیں حالانکہ یہ الزام قطعاً بے بنیاد ہے۔

ہر صاحبِ عقل یہ سمجھ سکتا ہے کہ جو گروہ یزیدؑ کو خلیفہ برحق سمجھتا ہو وہی قاتلانِ حسینؑ کا گروہ ہو سکتا ہے۔ ہمیں سخت تعجب ہے کہ شیعوں کو قاتلانِ حسینؑ کہنے والی جماعت کی طرف سے یزیدؑ کی حمایت میں متعدد کتابیں کیوں شائع ہو رہی ہیں جیسا کہ حضرت عمرؓ کے معتقد خاص محمود احمد عباسی نے خلافت معاویہ و یزید نامی کتاب لکھ کر یہ ثابت کیا ہے کہ حضرت عمر اور یزید کے اصول ایک ہی تھے۔ آپ اصل کتاب دیکھ کر اطمینان کر لیجیے۔

شیعانِ علیؑ کے عقائد میں یزیدؑ پر لعنت کرنا اجرِ عظیم رکھتا ہے۔ لیکن حضرت عمرؓ کے صاحبزادے حضرت عبداللہ بن عمر کی تقریر "صحیح بخاری" اور "صحیح مسلم" وغیرہ میں دیکھیے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ واقعہ حرہ کے بعد جبکہ اہلِ مدینہ یزیدؑ کی بیعت توڑنے لگے تو حضرت عبداللہ ابن عمرؓ نے بجز نبوی

میں اپنے لوگوں کو جمع کیا اور کہا کہ جو شخص یزید کی بیعت توڑے گا وہ مجھ سے جدا ہوگا" پھر کہا "کیونکہ ہم نے یزید کی بیعت خدا اور رسول کی بیعت پر کی ہے۔" ملاحظہ ہو صحیح بخاری کتاب الفتن، اردو ترجمہ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع کراچی جلد ۳ صہ ۱ اور صحیح مسلم جلد ۵ صہ ۱۳۶ ۔ لہٰذا محدثین اہل سنت کے نزدیک یہ واقعہ متفق علیہ ہے۔

بس غور کر لیجیے کہ یزید ملعون کی بیعت کو خدا اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیعت کہنے والے اور خود یزیدؑ کی بیعت کرنے والے عبداللہ ابن عمر کس مذہب میں بلند مقام رکھتے ہیں۔ خلیفہ اہلسنت حضرت عمر کے صاحبزادے عبداللہ یزیدؑ کو خلیفہ برحق تسلیم کرتے تھے اور اس کی اطاعت کو خدا اور رسولؐ کی اطاعت سمجھتے تھے۔ یاد رہے عبداللہ مذکور نہ صرف آپ کے خلیفہ دوم کے فرزند تھے بلکہ خلیفہ موصوف کے معتمد خاص اور شوریٰ میں نمائندہ خصوصی تھے جیسا کہ آپ کی معتبر کتب سے ثابت ہے کہ حضرت عمر نے چھ آدمی منتخب کئے تھے ان کے ساتھ عبداللہ بن عمر بھی تھے۔

اس واقعہ سے ثابت ہوا کہ مدینہ کی اکثریت بھی یزیدؑ کو خلیفہ تسلیم کر چکی تھی، بلکہ عبداللہ بن عمر تو یزیدؑ کو خلیفہ برحق تسلیم کرتے تھے اور اس کے طرفدار، فرمانبردار اور معتقد تھے۔ اسی لئے عبداللہ ابن عمر نے بیعت توڑنے کا ذکر کیا۔ اور توڑنا جب ہی ممکن تھا جب کہ پہلے بیعت کر چکے ہوں۔ فافہم۔ نیز یہ کہ یزیدؑ کی بیعت توڑنے والوں کے لئے "مجھ سے جدا ہوگا" کے الفاظ استعمال کئے۔ اب ایمانداری سے خوب غور کریں کہ عبداللہ ابن عمر مذہب شیعہ رکھتے تھے یا برعکس؟ جب کہ یہ بات ظاہر ہے کہ عبداللہ ابن عمر کا مذہب اہل سنت والجماعت تھا۔ لہٰذا مطلب یہ ہوا کہ یزیدؑ کی بیعت توڑنے والا اہلسنت سے جدا ہوگا۔ یعنی یا تو اہل سنت حضرات عبداللہ ابن عمر کو چھوڑیں یا یزیدؑ کو

خلیفہ ماننے کا اقرار کر لیں۔ اب تو ذرا سی عقل رکھنے والا بھی حقیقت کو سمجھ سکتا ہے کہ قاتلانِ حسینؑ جو یزیدؑ کو خلیفہ تسلیم کرتے تھے کس مذہب کے لوگ تھے؟

قاتلانِ حسینؑ کا مذہب وہی تھا جو یزیدؑ کو خلیفہ تسلیم کرنے والے حضرت عبداللہ ابن عمر کا صحیح بخاری سے ثابت ہوا۔ اور یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ عبداللہ ابن عمر مذہب شیعہ میں قطعاً کوئی مقام نہیں رکھتے۔ اس کے برعکس مذہب اہلسنت کی بنیاد ہی جن راویوں کی روایتوں پر ہیں عبداللہ ابن عمر ان راویوں میں سے ہیں اور اہلسنت کے نزدیک ان ہی کے مطابق میت پر رونا منع ہے آج بھی مذہب سنیہ میں یزید پلید کو اہلسنت کا چھٹا خلیفہ مانا جاتا ہے جیسا کہ ملا علی قاری نے شرح فقہ اکبر (مطبوعہ کتب خانہ رحیمیہ دیوبند) کے صہ ۸۳ پر یزید کو چھٹا خلیفہ اور صاحب ایمان لکھا ہے (معاذ اللہ)

اب آئیے نشانیوں والی بات کی طرف۔ اور ایمان سے کہیے کہ قاتل سے نشانی ایک ہی مرتبہ تو برآمد ہوتی ہے اور پھر حکومت اسے اپنے قبضہ میں لے لیتی ہے جب کبھی مقدمہ کی تاریخ آتی ہے تو نشانی عدالت میں پیش کی جاتی ہے قاتل کے لواحقین یہ کوشش کرتے ہیں کہ نشانی عدالت میں پیش نہ ہو اور متعلقہ افراد کو اس سلسلے میں رشوت دینے کو تیار ہوتے ہیں۔

اب سوچیے روکنے والے روکتے ہیں لیکن ہم نشانیاں پیش کرتے رہتے ہیں۔ لہٰذا اگر حسین علیہ السلام کے قاتل ہمارے بڑے بزرگ ہوتے تو ہم خود ان کے مظالم کی تشہیر نہ کرتے بلکہ قاتل وہ لوگ ہو سکتے ہیں جن کی اولاد کو تشہیر مظالم گوارہ نہیں ہے۔

آپ دل تھام کر سنیں تو عرض کروں کہ قصاص عثمان کے شوشہ پر حضرت عثمان کا کرتہ اور ان کی بیوی کی انگلیاں ان کے محب پیش کرنے والے تھے۔ وہ لوگ انتقام کے نعرے بلند کرتے اور خون سے لت پت کرتہ لوگوں

کو دکھاتے تھے تاکہ عوام کو ان کی مظلومیت کا احساس ہو۔ اس لحاظ سے وہ سب لوگ جو قتل عثمان پر روتے تھے اور کرتے وغیرہ پیش کرتے تھے کیا وہ خود بھی قاتل تھے؟ کیونکہ مقتول کی نشانی یعنی خون آلود کرتہ انہی سے برآمد ہوئی واضح رہے کہ ان لوگوں میں معاویہ، طلحہ، زبیر اور بی بی عائشہ بھی شامل تھیں۔ اس لئے نشانی پیش کرنے والوں کو قاتل قرار دینے سے پہلے ذرا سوچ لیا کریں۔

جو قصہ آپ حضرت یوسف ؑ کے بھائیوں کا پیش کرتے ہیں انہوں نے صرف ایک مرتبہ آنسو بہائے اور کرتہ یعقوب ؑ کو دیدیا۔ یعقوب ؑ کئی برس اس کرتے کی نشانی سامنے رکھ کر روتے رہے اور ان کے بیٹے منع کرتے رہے لہٰذا صاف ظاہر ہے کہ مظلوم کے حبدار نشانی دیکھ کر رویا کرتے ہیں اور ظالم اپنا ظلم چھپانے کی خاطر ناگوار سمجھتے ہوئے منع کیا کرتے ہیں۔ اب تو آپ خود فیصلہ کریں گے کہ حضرت یعقوب ؑ نہیں بلکہ ان کے بیٹے خطاوار تھے۔

افضل پنجابی گائیڈ (فاضل پنجابی کے امتحان کی امدادی کتاب ہے)

سنہ ۱۹۶۳ دوسرا پرچہ صفحہ ۷ میں یوسف زلیخا کی کہانی کے متعلق تحریر ہے۔ مولانا غلام رسول فرماتے ہیں کہ میں نے یہ قصہ قرآن مجید کی سورۃ یوسف احادیث نبوی امام غزالی کے ارشادات توریت شریف اور یوسف زلیخا جامی (فارسی) سے اخذ کیا ہے۔ پھر مولانا غلام رسول کے بیان کے مطابق چودھری محمد افضل خان ایڈیٹر گائیڈ مذکور صفحہ ۹۳ پر لکھتے ہیں۔ یوسف ؑ نے ایک نقش و نگار والے کمرے میں انہیں ٹھہرایا۔

ایک کمرے میں آپ نے بھائیوں کے ان کو جنگل میں لانے، مارنے اور کنوئیں میں پھینکنے کی تصویریں بنوائیں اور اس میں ان کو کھانے پر بلایا۔ وہ تصویروں کو دیکھ کر ششدر رہ گئے۔ اور کہنے لگے ہم یہاں کھانا نہیں کھا سکتے۔

اے محترم ناظرین! ملاحظہ فرمایا آپ نے؟ جناب یوسف ؑ نبی نے

اپنے بھائیوں کے مظالم اور اپنی مظلومیت کی تصویریں بنوائیں جنہیں برادران یوسف ؑ نے برداشت نہ کیا جس سے ثابت ہو گیا کہ مظلوم داستان ظلم کی شبیہیں بنائے تو سنت نبی یوسف علیہ السلام ہے اور جو ان تصویروں کو دیکھ کر برداشت نہ کریں ان کے متعلق واقعہ مندرجہ بالا کو پیش نظر رکھتے ہوئے خود فیصلہ کیجیے۔

تصویروں کا ذکر اصل کتاب "یوسف زلیخا" مولوی غلام رسول زیر عنوان "آنا برادران یوسف کا دوسری بار شہر مصر میں" صفحہ ۲۵ پر ملاحظہ فرمائیں۔

مندرجہ بالا تصریحات سے ثابت ہوا کہ قتل حسین ؑ سے شیعان علی ؑ کا کوئی تعلق نہ تھا۔ تاریخ ہماری حق پرستی کی ضامن ہے۔ امام علیہ السلام کے متعلق یہ کہنا کہ انہوں نے بددعا کی تھی تو جب یہی ثابت نہیں ہو سکتا کہ قاتل شیعان علی علیہ السلام تھے تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ بددعا شیعوں کے لئے تھی۔

ساتواں سوال

سوال ۷:۔ کیا شیعہ فرقہ دورِ سرکارِ دو عالم میں وجود رکھتا تھا۔ اس لفظ کے معنی تو پاک ہیں؟

جواب ۷:۔ اس سے پہلے کہ شیعوں کا وجود دورِ رسالتؐ میں ثابت کیا جائے لفظ "شیعہ" کے معنی دیکھئے۔ پہلے اس لفظ کو لغت کے میزان میں تولئے۔
لفظ شیعہ بروزن فعلۃ اسم صفت ہے ہر اس مرد کا یا عورت کا یا اس جماعت کا جو تابعداری کرے (الکشاف جلد ۲ صفحہ ۱۹۱ مطبوعہ مصر) شیعہ کا وزن فعلہ ہے جیسے فرقہ فقیہ اور مراد اس سے وہ جماعت ہے جس نے تابعداری کی اور مادہ شیاع ہے (البیضاوی جلد ۱ صفحہ ۲۴۶ مطبوعہ مصر) اس میں مذکر، مونث، جمع، واحد سب برابر ہوتے ہیں۔ (القاموس جلد ۳ صفحہ ۴۹) یعنی لفظ شیعہ واحد جمع، تثنیہ، مذکر، مونث پر مساوی طور پر واقع ہوتا ہے اس کی جمع شیع اور جمع الجمع اشیاع ہے (تفسیر جمل مطبوعہ مصر جلد ۳ صفحہ ۵۱۱) شیعہ کی جمع شیع ہے جیسے سدرۃ کی جمع "سدر" اور جمع الجمع "اشیاع" ہے قاعدہ صرف کی رُو سے یہی بنتی ہے۔ عربی دان حضرات دیکھیں رضی شرح شافیہ باب الجمع صفحہ ۱۵۶ اور المنجد صفحہ ۴۲۳۔ پوری گرامر کے قواعد اس کی دلالت میں ملیں گے۔ "المنجد" میں باب مفاعلہ سے نقل کرتا ہوں۔
"شایعہ تابعہ ووالاہ علی امر" یعنی کسی کی شایعت کرنے کا

مطلب اس کی پیروی اور محبت کرنا ہے کسی امر میں۔ کیونکہ شیعانِ حیدر کرار جناب امیر علیہ السلام کی پیروی و محبت کرتے ہیں لہٰذا وہ شیعہ ہیں۔
المنجد صفحہ ۴۲۳ ہی پر ہے کسی مرد کے شیعہ سے مراد اس کے تابعدار اور مددگار ہوتے ہیں۔ دیگر کتب میں بھی یہی لکھا ہے مثلاً منتہی الارب جلد ۲ صفحہ ۲۵۰ اور تفسیر جمل جلد ۳ صفحہ ۵۱۱۔

لفظ شیعہ بلا اضافت ہو تو اس کے معنی ایسی جماعت کے ہوتے ہیں جو کسی امر پر متفق اور مجتمع ہو جائے۔ (البیضاوی جلد ۱ صفحہ ۲۴۹) "شیع" جمع شیعہ کی ہے۔ اور وہ اس فرقے کا نام ہے جو متفق ہوا اور پر کسی طریقے اور مذہب کے اور اسی لئے اس کی جمع کی مذمت آئی ہے کیونکہ اتفاق و اتحاد ہے۔ معلوم ہوا کہ شیعہ مذہب واحد کا نام ہے۔ مختلف ہوئے تو شیعہ نہ رہے۔ تفسیر جمل جلد ۳ صفحہ ۵۱۱ میں ہے۔
"جو قوم کسی امر پر مجتمع ہو جائے پس وہی لوگ شیعہ ہیں"۔ یعنی یہ کہ لفظ شیعہ کے لغوی معنی بصورتِ اضافت تابعدار اور مددگار افراد کے ہوئے اور بلا اضافت متفق و مجتمع قوم کا نام ہوئے چنانچہ جس قوم کے افراد صالح ہوں گے اور امر نیک پر اتحاد ہو گا وہ قوم صالح ہو گی چونکہ مذہب شیعہ کے لوگ محمدؐ و آلِ محمدؐ کے تابعدار اور محب ہیں اور ساری قوم مذہب محمدؐ و آلِ محمدؐ پر متفق و مجتمع ہے لہٰذا شیعہ ہوئے۔

اصطلاحی معنی

اصطلاح اہل اسلام میں "شیعہ" اسم مذہبی ہے۔ یعنی لفظ شیعہ اسم بالغلبہ ہے ہر اس شخص کا جو کہ محبت رکھتا ہے حضرت علیؑ سے آپ کے اہل بیتؑ سے حتیٰ کہ یہ ان کا خاص نام ہو چکا ہے اور معنی عام سے معنی خاص کی طرف اس طرح منقول

ہو چکا ہے کہ بلا قرینہ لفظ شیعہ سے محبانِ علیؑ و فاطمہؑ سمجھے جاتے ہیں (دیکھیں قاموس جلد ۳ ص ۴۷ المنجد ص ۴۲۳ تفسیر مدارک جلد ۱ ص ۲ حاشیہ ۴)

عربی لغت میں لفظ شیعہ کے معنی پاک و مطہر کہیں نہیں ملتے ہیں۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی لکھتے ہیں کہ لقب "شیعہ" کی ابتداء جماعتی طور پر ۳۷ھ میں ہوئی جب کہ امیر المومنین علیہ السلام خلافت ظاہرہ پر متمکن ہوئے (تحفہ اثنا عشریہ ص ۲۸) عبدالعزیز محدث اہل سنت کے مشہور و معروف علامہ ہیں اور "تحفہ اثنا عشریہ" نامی کتاب انہوں نے مذہب شیعہ کے خلاف لکھی تھی۔ شاہ صاحب اپنی اس کتاب میں دعویٰ کرتے ہیں کہ شیعہ اولی ہم (سنی) ہیں چنانچہ لکھتے ہیں کہ:۔

"شیعہ کے چار فرقے ہیں، ان میں سے ایک فرقہ وہ ہے جو اہل سنت والجماعت کے لقب سے ملقب ہے اور وہی شیعہ اولے تھے مخلصین صحابہ اور تابعین بھی شیعہ اولے تھے" (کتاب مذکورہ ص ۹) پھر فرماتے ہیں:۔

"جاننا چاہیے کہ شیعہ اولی فرقہ سنیہ اور تفضیلیہ کا نام ہے۔ پہلے زمانے میں یہ لوگ بھی شیعہ لقب سے ملقب تھے لیکن جب غالیوں، رافضیوں، زیدیوں اور اسماعیلیوں نے اس لقب سے اپنے آپ کو ملقب کیا تو اعتقادی اور عملی برائیوں کے مرتکب ہونے لگے تو التباس باطل کے خوف سے فرقہ سنیہ اور تفضیلیہ نے اپنے آپ پر اس لقب کو پسند نہ کیا اور اپنا لقب اہل سنت والجماعت رکھ لیا۔ (کتاب مذکورہ ص ۱۷)

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی تحریر سے ثابت ہوا کہ دراصل اہل سنت والجماعت حضرات بھی ابتداء میں "شیعہ" ہی کہلواتے تھے لیکن بعد میں نام تبدیل کر لیا گیا۔ اب ذرا اس اعتراض پر غور فرمائیں کہ قاتلانِ حسینؑ

شیعہ تھے۔ چونکہ بقول اہلسنت "خیر القرون" زمانہ صحابہ و تابعین کا نام ہے اور لقب شیعہ کی ابتدا بقول شاہ صاحب اسی زمانہ سے ہوئی لہٰذا شاہ صاحب کے مطابق خیر القرون میں صحابہ کرام و تابعین شیعہ ہی تھے۔ سنی تو بعد میں بنے۔

تاریخی شہادت کے بعد اب قرآنی ثبوت ملاحظہ فرمائیں کہ حضرت نوحؑ (دینِ خدا کی پہلی شریعت آپؑ کے زمانے میں آئی) کا ذکر کرنے کے بعد اللہ فرماتا ہے۔ "وان من شیعتہ لابراھیم" بہ تحقیق ابراہیمؑ نوحؑ کے شیعوں میں سے تھے۔ تو قرآن مجید میں "شیعہ" کا نام بطور مذہب آگیا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ سنی یا اہلسنت والجماعت کا نام قرآن میں موجود نہیں ہے ورنہ ثابت کر دیجیے۔ تمام اہلِ اسلام کا ملتِ ابراہیمؑ ہونے کا دعویٰ ہے اور ابراہیمؑ حضرت نوحؑ کے شیعہ تھے۔ عاقل را اشارہ کافی است۔ مزید تفصیل کے لئے میرا رسالہ "تصدیق لفظ شیعہ" پڑھیں۔

اب قرآن مجید سے طے کر شاہد کون ہوگا؟ اب تو اس بات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ عہدِ نبویؐ میں شیعت کا وجود تھا یا نہیں (جبکہ اسلام کی سب سے پہلی شریعت میں "شیعہ" کا نام موجود ہے اور اس نبی کو شیعہ کہا گیا ہے جس نے ہمارا نام مسلمان رکھا ہے معلوم ہوا کہ مسلمان کا شیعہ کہلوانا خدا اور حضرت ابراہیمؑ کی سنت ہے۔ جبکہ خدا اپنی سنت تبدیل نہیں کرتا ہے) تاہم میں رسول اکرمؐ کی حدیث یاد دلاتا ہوں کہ آپ کے ہاں مشہور ہے کہ حضورؐ نے فرمایا موسیٰؑ کی امت کے ۷۱ عیسیٰؑ کی امت کے ۷۲ اور میری امت کے ۷۳ فرقے ہوتے ہیں ان میں ایک جنتی ہوگا اور باقی دوزخی ہوں گے۔"

تمام فرقوں کو دعوت ہے کہ وہ اپنے اپنے فرقے کے متعلق صحیح حدیث بتائیں کہ رسول اللہؐ نے فلاں فرقے کے متعلق فرمایا کہ وہ جنتی ہے۔ اگر نا کام رہیں تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اس ارشاد پر غور کریں کہ:۔

"اے علیؑ تو اور تیرے شیعہ جنتی ہیں"

(صواعق محرقہ علامہ اہلسنت ابن حجر مکی)

فرمانِ پیغمبر سے ثابت ہوتا ہے کہ زمانہ رسولؐ میں مسلمانوں (اصحابؓ) کی ایسی جماعت ضرور تھی جو علیؑ کے شیعہ تھے۔ اسی سلسلہ میں اس کے علاوہ بھی حضرت رسول کریمؐ کی احادیث بحوالہ کتب اہلسنت تحریر کرتا ہوں۔

عن جابر بن عبد اللہ قال کنا عند النبی صلی اللہ علیہ وسلم فاقبل علی فقال النبی والذی بیدہ نفسی ان ھذا وشیعۃ لھم الفائزون یوم القیامۃ ونزلت ان الذین آمنوا الایۃ فکان اصحٰب النبی اذا اقبل علی قالو قد جاء خیر البریہ۔

ترجمہ:۔ حضرت جابرؓ بن عبد اللہ سے روایت ہے کہ ہم رسولؐ اللہ کے پاس بیٹھے تھے کہ علیؑ تشریف لائے۔ حضورؐ نے ان کو دیکھ کر فرمایا مجھے اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے تحقیق یہ علیؑ اور اس کے شیعہ روز قیامت کامیاب ہوں گے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ تحقیق وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے اعمال صالح کئے وہی بہترین خلائق ہیں (خیر البریہ) اس کے بعد جب حضرت علیؑ آتے تو صحابہ کرام فوراً کہتے "خیر البریہ" یعنی بہترین خلق خدا آ گئے۔

ملاحظہ ہو کتب اہلسنت (۱) صواعق محرقہ ابن حجر مکی صفحہ ۹۶ (۲) تفسیر

فتح البیان علامہ اہلحدیث نواب صدیق حسن بھوپالی جلد ۱۰ صفحہ ۲۲۳ (۳) فتح القدیر مولفہ علامہ شوکانی جلد ۵ صفحہ ۴۶۴ (۴) تفسیر در منثور علامہ حافظ جلال الدین سیوطی صفحہ ۳۷۹ جلد ۶

حدیث معظمہ سے حضرت علیؑ کا جناب رسول مقبولؐ کے بعد افضل المخلوقات ہونا اور شیعوں کو روز قیامت کامیاب ہونا ثابت ہو رہا ہے۔

دوسری حدیث پیش خدمت ہے:۔

ترجمہ:۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب یہ آیت ان الذین آمنو . . . نازل ہوئی تو حضورؐ پر نور نے حضرت علیؑ کو فرمایا کہ وہ لوگ جن کی شان میں یہ آیت نازل ہوئی ہے تو اور تیرے شیعہ ہیں۔ روز قیامت خدا ان سے راضی ہوگا اور وہ خدا سے راضی ہوں گے۔

روایت اہلسنۃ:۔ (۱) تفسیر فتح القدیر جلد ۵ صفحہ ۴۶۴ (۲) فتح البیان صفحہ ۲۲۳ جلد ۱۰ (۳) صواعق محرقہ صفحہ ۹۶

اس کے علاوہ ملاحظہ فرمائیں اسی مضمون کی احادیث (۱) تفسیر ابن جریر مولفہ ابو جعفر محمد بن جریر طبری جلد ۳۰ صفحہ ۱۴۶ مطبوعہ مصر (۲) اسعاف الراغبین صفحہ ۱۵۶ (۳) کنز العمال جلد ۶ صفحہ ۲۱۸ (۴) فردوس الاخبار دیلمی (۵) ریاض النضرۃ محب الدین طبری (۶) مناقب علامہ ابو بکر بن مردویہ (۷) معجم کبیر علامہ طبرانی (۸) مناقب امام احمد بن حنبل۔ وغیرہ وغیرہ۔

بشارت رسولؐ

ام المومنین حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ جناب فاطمہؑ حضرت رسول کریمؐ کے پاس آئیں اور حضرت امیرؑ بھی ان کے ہمراہ تھے۔ حضورؐ نے ان کی طرف سر اٹھا کر فرمایا یا علیؑ تم کو بشارت ہو کہ تو اور تیرے شیعہ جنت میں ہوں گے۔

(مناقب صحابہ فخر الاسلام نجم الدین بحوالہ تاریخ الشیعہ ص۸۱)

پس ثابت ہوا کہ شیعہ عہدِ رسالت میں موجود تھے اور اس بات کی شہادت قرآنِ مجید اور احادیث رسولؐ میں ملتی ہے کہ یہی جماعت مقدس برحق اور ناجی ہے۔ جب اہل سنت جماعت کا نام بطورِ فرقہ یا مذہب نہ ہی قرآن مجید میں ہے اور نہ ہی احادیث رسولؐ میں۔ اسی لئے مشہور علامہ اہل سنت امام فخر الدین رازی نے اپنی تفسیر کبیر میں معیار اہلسنت والجماعت اس طرح لکھا ہے کہ :-

الا ومن مات علی حب آل محمد مات علی السنۃ والجماعۃ

یعنی جو شخص محبت آل محمدؐ میں فوت ہوگا وہ ہی میری سنت کا پیروکار اور میری جماعت کا فرد ہوگا۔ (تفسیر کبیر جلد۲ ص۳۹۰)

معلوم ہوا کہ سنت رسولؐ کی پیروی اور حضورؐ کی جماعت کا رکن ہونے کا دعویٰ بغیر محبتِ آل محمدؐ کے ممکن نہیں اور محبت اسی وقت خالص ہوگی جب محبوب کے دشمنوں سے بیزاری اختیار کی جائے۔ فافہم۔

آٹھواں سوال

سوال۸ :- شہادت امام حسین علیہ السلام میں یزید لعین کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ کیا واقعہ کربلا اہلِ کوفہ کی حرص منصب وانعام کا نتیجہ نہ تھا؟ کیا یزید لعین نے قتلِ حسین علیہ السلام کا حکم دیا تھا؟

جواب :- ماشاءاللہ جھوٹ کے پیر نہیں ہوتے شیعوں کو قاتلانِ حسینؑ کہتے ہیں اور خود ہی یزید لعین کی صفائی دیتے ہیں۔ اب بتایئے قاتل کی صفائی مقتول کے ساتھی دیتے ہیں یا قاتل کے؟ جو لوگ کہتے ہیں کہ قتل حسینؑ یزید لعین کے منشا کے خلاف تھا یا یزید لعین تو صرف یہ چاہتا تھا کہ حسینؑ بیعت کر لیں نہ کہ اس کا یہ مقصد تھا کہ حسینؑ کو عالمِ بے بسی میں شہید کیا جاوے۔ وہ لوگ کتابوں اور تقریروں کے ذریعہ اس تگ ودو میں مصروف نظر آتے ہیں کہ کوئی نہ کوئی ایسی راہ مل جائے جس کے سہارے یزید لعین کو اس بدنامی سے بچایا جائے مگر عزت وذلت تو صرف خدا کے ہاتھ میں ہے جسے چاہے معزز بنا دے جسے چاہے ذلیل وخوار کر دے۔ ایسے یزید نواز لوگوں کے ہنگاموں، کوششوں کے باوجود لوگ اپنی اولاد کا نام "یزید" رکھنے پر بھی تیار نہیں۔ اور یزید لعین کی صفائی دینے والوں کی کوششوں سے . . . نہ تو حسین علیہ السلام کی مظلومیت کی تردید ہو سکی اور نہ ہی یزید لعین قتلِ حسینؑ کے الزام سے بری قرار پایا۔

قبل اس کے کہ ہم تاریخ کے اوراق پلٹیں اور دیکھیں کہ یزید لعین کا ارادہ کیا تھا ہم بہتر سمجھتے ہیں کہ اس ہستی کی گواہی پیش کریں جسے کفار ومخالفین

نے بھی صادق اور امین تسلیم کیا۔ کائنات کا سب سے سچا شاہد امام الصادقین سید المرسلین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے فرزند کے قاتل کی پیشگوئی یوں ارشاد فرماتے ہیں :-

"عن عائشہ یزید لا بارک اللہ فی یزید الطحان اللعان اما انہ نعی الی حبیبی و حبیبی حسین اتیت بتربت ورایت قاتلہ اما انہ یقتل بین ظہرانی قوم فلا ینصرونہ الا عمہم اللہ بعقاب"

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اپنی روایت میں مزید فرماتی ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ قاتل و ملعون یزید کو برکت نہ دے۔ اس نے میرے پیارے بیٹے حسینؑ کے ساتھ بغاوت کی اور انہیں شہید کرایا۔ حسینؑ کی تربت کی مٹی میرے پاس لائی گئی اور مجھے ان کا قاتل بھی دکھایا گیا اور بتایا گیا کہ جن کے روبرو حسینؑ قتل کئے جائیں گے وہ ان کی مدد نہیں کریں گے اور اسی سبب سے اللہ تعالیٰ نے ان پر ایک عذاب مسلط کر دیا ہے۔ (روایات اہلسنت ما ثبت بالسنۃ صفحہ ۲۱۹ بحوالہ ابن عساکر)

رسول کریمؐ کی اس پیشین گوئی کہ جس میں یزید لعین کا صریحاً نام موجود ہے کہ وہ قاتل و ملعون ہے جو بزبان صدیقہ اہلسنت حضرت بی بی عائشہ رض سے مروی ہے کہ اس بات پر مزید کسی جرح کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی ہے کہ یزید کو قتل حسینؑ میں ملوث ثابت کیا جائے مگر پھر بھی ہم تاریخ اسلام سے ناقابل تردید ثبوت پیش کریں گے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ یزید ملعون کے حکم سے امام حسینؑ کو شہید کیا گیا۔ اگر مقدمہ شہادت لکھا جائے تو بات دور دراز تک پہنچ جاتی ہے حتیٰ کہ سقیفہ اور بدر و حنین وغیرہ کی تاریخ پر غور کرنا پڑتا ہے جیسا کہ کتاب الالفاظ الکتابیہ عبدالرحمٰن بن عیسیٰ ہمدانی

سنی المذہب مطبوعہ بیروت صفحہ ۱۴۳ میں ہے کہ ایک بالغ النظر ہاشمی سے دریافت کیا گیا کہ امام حسین علیہ السلام کب شہید کئے گئے تو اس نے جواب دیا کہ دراصل حسین علیہ السلام سقیفہ بنی ساعدہ کے دن شہید ہوئے۔ غور کرنا چاہیئے کہ اس نے ایسا کیوں کہا۔؟

لیکن یہاں ہم صرف ان چند روایات پر تبصرہ کریں گے جو سراسر ثابت کرتی ہیں کہ یزید لعین قتل حسینؑ سے راضی تھا۔ مسلمانوں کی بدعلی اور عوام کے لعن طعن سے مرعوب ہو کر بے شک یزید لعین نے اپنے کندھے پر سے کمان اتارنے کی عریاں کوشش کی لیکن تیر نشانہ پر بیٹھ چکا تھا۔

سب سے پہلے میں ناظرین کی توجہ اس واقعہ کی طرف مبذول کراتا ہوں جب یزید لعین شرح فقہ اکبر صفحہ ۸۲ والی خلافت جو کہ ہماری نظر میں محض حکومت ہے کی مسند پر آیا اور اس نے لوگوں سے بیعت لینا شروع کی۔ اسی سلسلہ میں اس نے حاکم مدینہ کو بذریعہ خط امام حسین علیہ السلام کی بیعت لینے کو لکھا۔ تاریخ میں وہ خط پورا درج ہے۔ آپ اس کے مطالعہ سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ یزید لعین کیا چاہتا تھا؟ یزید لعین کے خط سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ سانحہ کربلا محض اتفاقی حادثہ نہ تھا۔ یزید لعین نے حکم دیا تھا کہ حسینؑ اگر بیعت نہ کریں تو قتل کر دیئے جائیں (ملاحظہ فرمائیں محرم نامہ شمس العلماء خواجہ حسن نظامی سجادہ نشین درگاہ حضرت نظام الدین اولیاء)

تاریخ سے ثابت ہے کہ جب یزید لعین کے گورنر مدینہ ولید نے امام حسینؑ کو بلایا تو انہیں یزید لعین کا یہ پیغام پڑھ کر سنایا کہ مجھے حکم ملا ہے کہ یا آپ سے بیعت لوں یا قتل کر دوں۔ اس حکم سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یزید لعین کا منشاء کیا تھا۔ اسے یہ کلی طور پر یقین تھا کہ حسین علیہ السلام میری بیعت نہیں

کریں گے۔ وہ حسین علیہ السلام کو اپنی راہ کا کانٹا سمجھ کر ہٹانا چاہتا تھا۔
شہادت حسینؑ کے بعد قافلۂ سادات کے اسیروں سے یزید لعین کا ظالمانہ سلوک بھی اس بات کا روشن ثبوت ہے کہ قتل حسینؑ سے یزید لعین کی دلی آرزو پوری ہوئی۔ اس لعین نے قتل حسینؑ پر کسی قسم کا اظہارِ افسوس نہیں کیا اور نہ ہی قاتلانِ حسینؑ کو برا کہا بلکہ اس کے برعکس اس کے حکم سے دربار اور شہر میں چراغاں کیا گیا، سجاوٹ ہوئی، دربارِ عام میں رسول اللہؐ کی بیٹیوں کی پیشیاں ہوئیں۔ ملاحظہ کیجیے کتاب "آل محمد کربلا میں" مصنفہ عمر ابو النصر ترجمہ محمود احمد پانی پتی۔

ایسے واقعات ثابت کرتے ہیں کہ قتل حسینؑ سے یزید لعین کو تسکین و فرحت محسوس ہوئی یہ الگ بات ہے کہ اس کا اثر عاجل نہ رہ سکا۔ بادشاہ کو باغی پر غلبہ پانے سے تسکین ہوتی ہے اور یزید لعین کی نظر میں حسینؑ معاذ اللہ باغی تھے۔ کیونکہ یزید کو اکثریت نے خلیفہ تسلیم کر لیا تھا۔ لہٰذا اس طرح یزید لعین کی جمہوری خلافت کے مخالف ہونے کی وجہ سے حسینؑ واجب القتل تھے (لیکن معاویہ اور دیگر باغیوں کے معاملہ میں جنہوں نے خلیفہ راشد علی ابن ابیطالب علیہ السلام سے بغاوت کی تھی اس بات کو گول کر دیا جاتا ہے)

معتبر کتب تاریخ ثابت کرتی ہیں کہ یزید لعین نے اپنی چھڑی سے سر مبارک جناب سید الشہداؑ کو ٹھوکر دے کر آسمان کی طرف منہ کر کے کہا۔

"کاش میرے بدر والے بزرگ آج زندہ ہوتے اور یہ نظارہ دیکھتے تو خوشی کے نعرے لگاتے میں خندف سے نہیں تھا اگر آل محمدؐ سے انتقام نہ لیتا بنو ہاشم نے تو حکومت کے لئے ڈھونگ رچایا تھا ورنہ کوئی وحی نازل نہ ہوئی تھی اور نہ ہی نبوت آئی تھی۔"

(تاریخ طبری مطبوعہ لندن اور تذکرۃ الخواص علامہ سبط ابن جوزی)

یزید پلید کے کفر و ظلم کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے مشہور مورخ یعقوبی سے مروی ہے کہ یزید لعین نے ابن زیاد لعین کو حسین کے قتل کا حکم دیا تھا۔
(سمو المعنی سمو الذات علائلی ص۶)

تاریخ طبری اور تاریخ الحسین کے مطالعہ سے ہر شخص پر عیاں ہوتا ہے کہ قتل حسینؑ میں یزید لعین کا پورا پورا ہاتھ تھا اور یہ قتل اسی کے حکم سے ہوا۔ مؤلف "تاریخ سرِ امام حسین علیہ السلام" جناب انجم وزیرآبادی اور مولوی محمد داؤد فاروقی مصنف "خونِ کربلا" شہادتِ امام حسین علیہ السلام کے بعد یزید لعین کی کیفیت اس طرح لکھتے ہیں کہ:

"جب یزید لعین قتل امام حسینؑ سے فارغ ہوا تو اس کے غرور اور تکبر و نخوت کی کوئی انتہا نہ رہی بلکہ اس کی شقاوت و قساوت میں اور اضافہ ہوا اس نے منہیات شرعیہ کو اپنے عہد میں علانیہ رواج دیا اور مسلم بن عقبہ کو بارہ ہزار آدمیوں کے ساتھ مدینہ منورہ کے تاخت و تاراج کے لئے روانہ کیا۔"
(اسی مضمون کو علامہ حافظ جلال الدین سیوطی نے تاریخ الخلفاء میں تفصیل سے درج کیا ہے۔

ہم نے جس طرح زبانِ رسولؐ سے یزید لعین کو قاتلِ حسینؑ ثابت کیا ہے اسی طرح ترجمانِ حق کے ارشاد ہی سے کردار یزید نقل کرتے ہیں۔

اہلسنت کے مشہور محدث رویانی اپنی مسند میں حضرت ابو درداؓ صحابئ رسولؐ سے ایک روایت رقم کرتے ہیں جس کا مضمون یہ ہے کہ:

"میں نے حضور اقدس نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے سنا کہ حضورؐ نے فرمایا کہ میری سنت کا پہلا بدلنے والا بنی امیہ کا ایک شخص ہوگا جس کا نام یزید ہوگا۔"
(سوانح کربلا سواد اعظم مفتی محمد نعیم الدین ص۶۵)

ابو العلیٰ نے اپنی مسند میں حضرت ابو عبیدہ سے روایت کی کہ حضور پر نور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت میں عدل و انصاف قائم رہے گا یہاں تک کہ پہلا رخنہ انداز و بانیٔ ستم بنی امیہ کا ایک شخص ہوگا جس کا نام یزید ہوگا۔

(سوانح کربلا مؤلفہ صدر الافاضل مفتی محمد نعیم الدین ص [illegible])

اب قارئین کرام عقل و انصاف سے فیصلہ فرمائیں کہ جس شخص کو رسول کریم ﷺ بانیٔ ستم اور سنت کو تبدیل کرنے والا شخص فرمائیں اور اسے قتل حسینؑ کا ذمہ دار قرار دیں اس مردود کی حمایت کرنے والے قاتلانِ حسین علیہ السلام کی اولاد ہونگے یا اس پر لعنت و تبرا کرنے والی جماعت ---؟

چنانچہ ایسے بدکردار بادشاہ کی حمایت میں اس کے کارناموں کی تعریف کرتے ہوئے آنجہانی عباسی مؤلف کتاب "خلافت معاویہ و یزید" لکھتا ہے کہ:

"اس پر سیدنا حسین علیہ السلام نے خروج کیا تھا۔" (معاذ اللہ)

اسی طرح دورِ حاضر میں کچھ لوگ نہ صرف یزید لعین کو واقعاتِ کربلا سے بری الذمہ قرار دینے کی کوشش میں مصروف ہیں بلکہ اسے خلیفۂ راشد، امیر المومنین اور مظلوم شخص ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور صرف کر رہے ہیں۔ ایسے کور باطن، روسیاہ اور ملعون کو رحمۃ اللہ علیہ علانیہ لکھا جا رہا ہے۔ لہٰذا ضروری سمجھتا ہوں کہ ایسے یزیدیوں کے ممدوح کا کردار چند واقعات کی روشنی میں ہدیہ ناظرین کر دوں تاکہ انہیں معلوم ہو جائے کہ کلمہ گو افراد اجرِ رسالت کیسے ادا کر رہے ہیں۔ چنانچہ اہل سنت کے صدر الافاضل مولانا مفتی حافظ حکیم محمد نعیم الدین اپنی کتاب "سوانح کربلا" میں واقعاتِ بعد شہادتِ امام یوں سپرد قلم کرتے ہیں:

"حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا وجود مبارک یزید لعین کی بے قاعدگیوں کے لئے ایک زبردست محتسب تھا۔ وہ جانتا تھا کہ آپؓ کے زمانہ مبارک میں اس کو بے مہاری کا موقع میسر نہ آئے گا اور اس کی کجروی اور گمراہی پر حضرت امام صبر نہ فرمائیں گے۔ اس کو نظر آتا تھا کہ امام جیسے دیندار کا تازیانۂ تعزیر ہر وقت اس کے سر پر گھوم رہا ہے۔ اسی وجہ سے وہ اور بھی زیادہ حضرت امام کی جان کا دشمن تھا اور اسی لیے حضرت امام کی شہادت اس کے لئے باعث مسرت ہوئی۔ حضرت امام کا سایہ اٹھنا تھا کہ یزید کھل کھلا اور انواع و اقسام کے معاصی کی گرم بازاری ہو گئی۔ زنا، لواطت، حرامکاری، بھائی بہن کا بیاہ، سود، شراب دھڑلے سے رائج ہو گئے۔ نمازوں کی پابندی اٹھ گئی۔ تمرد کی سرکشی انتہا کو پہنچی شیطنت نے یہاں تک زور کیا کہ مسلم بن عقبہ کو بارہ ہزار یا بائیس ہزار کا لشکر گراں دے کر مدینہ طیبہ کی چڑھائی کے لئے بھیجا۔ یہ ۶۳ھ کا واقعہ ہے۔ اس نامراد لشکر نے مدینہ طیبہ میں وہ طوفان برپا کیا کہ العظمۃ للہ۔ قتل و غارت اور طرح طرح کے مظالم ہمسائیگان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وبارک وسلم پر کئے۔ وہاں کے ساکنان کے گھر لوٹ لئے سات سو صحابہ کو شہید کیا۔ اور دوسرے عام باشندے ملا کر دس ہزار سے زیادہ کو شہید کیا۔ لڑکوں کو قید کر لیا۔ ایسی ایسی بدتمیزیاں کیں جن کا ذکر کرنا ناگوار ہے مسجد نبوی شریف کے ستونوں میں گھوڑے باندھے۔ تین دن تک مسجد شریف میں لوگ نماز سے مشرف نہ ہو سکے۔ صرف حضرت سعید ابن مسیب رضی اللہ عنہ مجنوں بن کر وہاں حاضر رہے[1]۔ حضرت عبد اللہ بن حنظلہ غسیل الملائکہ نے فرمایا کہ یزیدیوں کی ناشائستہ حرکات اس حد تک پہنچی ہیں کہ ہمیں اندیشہ

---

(۱) معلوم ہوا کہ تقیہ حضرت سعید ابن مسیب کے نزدیک جائز و مباح تھا۔

ہونے لگا کہ ان کی بدکاریوں کی وجہ سے کہیں آسمان سے پتھر نہ برسیں۔ پھر یہ لشکر شرارت اثر مکہ مکرمہ کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں امیر لشکر مر گیا۔ اور دوسرا شخص اس کا قائم مقام کیا گیا۔ مکہ معظمہ پہنچ کر ان بے دینوں نے منجنیق سے سنگ باری کی۔ اس سنگ باری سے حرم شریف کا صحن مبارک پتھروں سے بھر گیا اور مسجد حرام کے ستون ٹوٹ پڑے اور کعبہ مقدسہ کے غلاف شریف اور چھت کو ان بے دینوں نے جلا دیا۔ اسی چھت میں اس دنبہ کے سینگ بھی تبرک کے طور پر محفوظ تھے جو سیدنا حضرت اسماعیل علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کے فدیہ میں قربان کیا گیا تھا۔ وہ بھی جل گئے۔ کعبہ مقدسہ کئی روز بے لباس رہا اور وہاں کے باشندے سخت مصیبت میں مبتلا رہے۔ آخر کار یزید پلید کو اللہ تعالیٰ نے ہلاک فرمایا۔" (کتاب مذکورہ ص۱۱۸ و ص۱۱۹)

یزید بن معاویہ اموی وہ نام ہے جس پر ہر ساعت لعنت ہو رہی ہے اور ہر قرن میں دنیائے اسلام نے اس پر ملامت کی ہے۔ چنانچہ علامہ اہلسنت واقدی نے حضرت عبداللہ ابن حنظلہ غسیل کا قول لکھا ہے کہ:

"خدا کی قسم ہم نے یزید پر اس وقت خروج کیا جب ہمیں اندیشہ ہو گیا کہ اس کی بدکاریوں کے سبب آسمان سے پتھر نہ برسنے لگیں" یہ وہ حقائق ہیں جن سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اب اگر بالفرض محال یہ مان لیا جائے کہ یزید کو شہادت امام حسین مقصود نہ تھی بلکہ وہ صرف بیعت لینا چاہتا تھا تو بھی بعد از شہادت امام اس کا کردار اتنا فاجرانہ اور کافرانہ ہے کہ اسے مومن سمجھنا اسلام کی بے حرمتی کرنا ہے۔

حدیث مغفور اور یزید

جو لوگ یزید کی صفائی میں وکالت کرتے ہیں وہ تاریخی روایات کا شدت سے انکار کرتے ہیں اور اپنی بات مکارانہ طرز پر ٹھونسنا چاہتے

ہیں مگر یزید کو مغفور ثابت کرنے کے لئے وہ ایک حدیث کو یزید پر چسپاں کرنے کے لئے تاریخ ہی کا سہارا لیتے ہیں۔ کیونکہ صحیح بخاری کی اس حدیث کے مطابق قیصر کے لشکر روم کو مغفرت کی بشارت دی گئی ہے۔ اس حدیث میں یزید یا کسی اور کا نام موجود نہیں ہے البتہ تاریخ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یزید اس لشکر میں موجود تھا۔ پس اس تاریخی حوالہ کے سہارے یہ یزید کے معتقد اسے مغفور خیال کرتے ہیں۔ اولاً تو حدیث موضوع و متفقہ نہیں ہے تاہم یہ حدیث بھی یزید کے مناقب و محامد ثابت کرنے کے لئے کافی نہیں ہو سکتی ہے۔ چنانچہ یہ بحث ہم مشہور و معروف محدث اہلسنت شاہ ولی اللہ دہلوی کے الفاظ سے پیش خدمت کرتے ہیں:

"مغفور لہم" کے ارشاد نبوی کو دلیل بنا کر بعض لوگ یزید کی نجات پر استدلال کرتے ہیں کیونکہ وہ اس دوسرے لشکر میں شامل بلکہ اس کا سپہ سالار تھا جیسا کہ تاریخ گواہی دیتی ہے لیکن صحیح بات یہ ہے اس حدیث سے صرف اتنی بات ثابت ہوتی ہے کہ اس غزوے سے پہلے کے گناہ جو یزید نے کئے تھے وہ بخشے گئے۔ کیونکہ جہاد کفارات میں سے ہے اور کفارات کا معاملہ یہ ہے کہ ان سے پہلے کے گناہ زائل ہوتے ہیں نہ کہ بعد کے۔ ہاں اگر آنحضور کے کلام کے ساتھ یہ الفاظ بھی ہوتے کہ اس مغفرت قیامت کے دن تک ہے تب بیشک اس کی نجات پر دلالت کرتے اور اگر یہ الفاظ نہیں ہیں تو نجات پر دلالت بھی نہیں ہے۔ بلکہ اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔ اس غزوے کے بعد جن قبائح کا ارتکاب اس نے کیا یعنی حسین رضی اللہ عنہ کو قتل کیا، مدینہ منورہ کو تباہ کیا اور شراب نوشی پر اصرار کیا ان پر اگر اللہ چاہے تو معاف کر دے اور چاہے تو

عذاب دے۔ جیسا کہ تمام گناہ گاروں کے بارے میں طے شدہ ہے۔ اور
اگر اس کی شمولیت تمام گناہوں میں مان لی جائے تو تمام عاصیوں کے
متعلق جو عمومی اصول طے ہے (کہ ان کی معافی اور سزا دونوں کا امکان
ہے) یزید کے معاملے میں وہ عموم بھی باقی نہ رہے گا بلکہ اس میں وہ احادیث
تجدید و تخصیص پیدا کر دیں گی جن میں اہل بیت کا استخفاف کرنے والوں
حرم میں الحاد کرنے والوں اور سنت میں رد و بدل کرنے والوں کو وعید ہے۔

(شرح تراجم الابواب صحیح بخاری، کتاب الجہاد، باب ماقیل فی قتال الروم)

شاہ ولی اللہ والد شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی اس فیصلہ کن
عبارت کے بعد یزید پرستی کے تابوت میں آخری کیل لگا دی گئی ہے۔

جنگ قسطنطنیہ اور یزید ملعون

ناصبیوں نے آج کل بخاری کی اُم الحرام والی اکلوتی حدیث سے یزید
کی ظالمانہ کارروائیوں پر مغفرت کے پردے ڈالنے کی بھرپور کوشش شروع
کر رکھی ہے۔ اور اس کو مغفور و بے قصور ثابت کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور صرف
کیا جا رہا ہے۔ حتیٰ کہ اس کی اتنی مبالغہ سے بھرپور قصیدہ خوانی کی جا رہی ہے کہ
اس کو مُوحد جنتی تک بتایا جا رہا ہے۔ ہم بہتر خیال کرتے ہیں یزید کی اس قسطنطنیہ
والی ڈھال کو توڑ کر اس کا سیاہ و سینہ چاک کر دیا جائے تاکہ اس کے حواری
اپنے گریبانوں میں جھانک کر یا تو شرم کے مارے ڈوب مریں یا پھر بغلیں
جھانکتے پھریں۔

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ قسطنطنیہ پر حملہ کرنے والا پہلا گروہ سنہ ۵۰ھ
میں بلاد روم کو فتح کرتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ اس لشکر کا سردار سفیان بن عوف

تھا جیسا کہ عمدۃ القاری شرح صحیح بخاری جلد ۱۴ صفحہ ۲۲۹ پر علامہ عینی نے بیان
کیا ہے۔

حافظ ابن کثیر دمشقی جیسے جھگڑالو علامہ اقرار کرتے ہیں کہ

"معاویہ نے سنہ ۵۰ھ میں ایک جیش جرار روم کے شہروں کی طرف بھیجا
اور اس کا سردار سفیان بن عوف کو بنایا جب معاویہ نے اپنے بیٹے یزید کو اس لشکر
کے ساتھ جانے کا حکم دیا تو اس نے بہانہ سازی کی اور نہ گیا پس اس کا باپ اسے روکنے
پر مجبور ہو گیا۔ اس مہم جنگ قسطنطنیہ میں فوج کو سخت بھوک پیاس اور بیماری کا
سامنا کرنا پڑا۔ اس وقت یزید نے خوش ہو کر اشعار پڑھے کہ مجھے پرواہ نہیں کہ لشکریوں
کا فرقدونہ کے مقام پر تپ و تکالیف و مصائب سے کیا برا حال ہوا۔ میں تو دیر مران
میں تکیہ لگا کر ام کلثوم (زوجہ یزید) سے ہم بستری کر رہا ہوں۔ (ام کلثوم بنت عبداللہ
بن عامر، یزید کی بیوی تھی) جب معاویہ نے یزید کے یہ اشعار سنے تو قسم کھائی کہ
اب میں یزید کو سرزمین روم پر سفیان بن عوف کے پاس فوراً روانہ کروں گا تاکہ
اس کو بھی ان مصائب و تکالیف کا احساس ہو جو قسطنطنیہ کے لشکریوں نے جھیلے۔"

پس ثابت ہوا کہ نہ ہی یزید لشکر قسطنطنیہ کا امیر مقرر رہا اور نہ ہی اس
نے اس لشکر میں شرکت کی۔ لہٰذا اس کی مغفرت کا قیاس کرنا بیوقوفوں کی جنت میں
سیر کرنا ہے۔

عہد حاضر کے مشہور اہل سنت علامہ مولوی محمد شفیع صاحب اوکاڑوی نے
اپنی کتاب "امام پاک اور یزید پلید" میں اس سے متعلقہ امور اخذ کیے ہیں جن کو
نقل کیا جاتا ہے۔

(۱) یہ کہ وہ پہلا لشکر جو بلاد روم کی طرف جہاد کے لئے گیا اس کے قائد و
امیر حضرت سفیان بن عوف تھے۔ یزید نہ تھا

(۲) یہ کہ یزید اس سے پہلے لشکر میں نہ تھا اور بشارت و مغفرت پہلے لشکر کے ساتھ خاص ہے جیسا کہ حدیث میں صراحت ہے لہٰذا یزید اس کا مصداق نہ ہوا۔

(۳) یہ کہ یزید کو راہِ خدا میں جہاد کرنے سے کوئی قلبی لگاؤ نہ تھا کہ باوجود حضرت معاویہ کے حکم کے اس نے طرح طرح کے حیلے بہانے بنا کر جان چھڑائی اور اپنے باپ کے حکم اور جہاد سے روگردانی کی۔

(۴) یہ کہ یزید کو مجاہدینِ اسلام سے کوئی ہمدردی اور ان کے دکھ درد اور بھوک پیاس میں مبتلا ہو جانے کا کوئی احساس نہ تھا بلکہ اس کی بے پرواہی کا یہ عالم کہ میری بلا سے کون بھوک پیاس سے مر رہا ہے اور کون تکالیف و مصائب کا شکار ہے۔

(۵) یہ کہ اس کی عیش پرستی کا یہ عالم تھا کہ اس نے کہا مجھے تو دیرمران کے مزین و مکاف فرش و فروش اور ام کلثوم کے ساتھ عیش چاہیئے۔

(۶) یہ کہ وہ دوسرے لشکر کے ساتھ بطور سزا کے بھیجا گیا تھا، کیونکہ حضرت امیر معاویہ نے اس کے اشعار سن کر قسم کھائی تھی کہ اب اس کو ضرور بھیجوں گا تاکہ اس کو بھی مصیبتیں پہنچیں جو لوگوں کو پہنچی ہیں لہٰذا اس کو مجبوراً بادلِ نخواستہ قہرِ درویش بجانِ درویش کے طور پر جانا پڑا اور وہ اخلاص کے ساتھ راہِ خدا میں جذبۂ جہاد کے ساتھ سرشار ہو کر نہیں گیا تھا۔

(۷) یہ کہ جہاد عبادت ہے اور عبادت میں اخلاص شرط کے بغیر کوئی عبادت قبول نہیں ہوتی اور اس روایت سے اظہر من الشمس ہے کہ اس کا غزوہ میں شریک ہونا بطور سزا تھا، اخلاص کے ساتھ نہ تھا۔

ایک دلیل

علامہ جلال الدین سیوطی اپنی "تاریخ الخلفاء" میں عبدالملک بن مروان کی ایک وضاحت تحریر فرماتے ہیں جس پر غور کرنے سے ہر صاحبِ انصاف نتائج اخذ کر سکتا ہے۔

"عبدالملک بن مروان نے خالد بن یزید اور یزید کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ امیر معاویہؓ نے یزید کو اپنی زندگی ہی میں ولی عہد مقرر کیا تھا[1] اس وجہ سے لوگ ان سے ناخوش تھے[2] حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دو شخصیتوں نے مسلمانوں میں فساد کا بیج بویا ان میں ایک عمرو بن العاص جنھوں نے جنگ صفین میں امیر معاویہ کی جانب سے نیزوں پر قرآن شریف بلند کرائے۔ ابن قرا کا بیان ہے کہ عمرو بن عاص ہی وہ شخص ہیں جنھوں نے خوارج کو حکم (ثالث) مقرر کیا تھا جس کا وبال قیامت تک ان کی گردن پر رہے گا۔ دوسری فتنہ انگیز شخصیت مغیرہ بن شعبہ کی ہے جو امیر معاویہؓ کی طرف سے کوفہ کے گورنر تھے۔ ان کو امیر معاویہ نے ایک حکم بھیجا کہ جس وقت تم میرا مکتوب پڑھو خود کو اسی وقت معزول سمجھو۔ مغیرہ نے اس حکم کو نہیں مانا اور چند روز کے بعد خود معاویہؓ کے پاس پہنچے۔ معاویہ نے اس دیر حاضری کی وجہ دریافت کی تو مغیرہ بن شعبہ نے کہا میں ایک اہم کام کی تکمیل میں مصروف تھا جس کے باعث تعمیلِ حکم میں اتنی تاخیر ہوئی۔ امیر معاویہ نے پوچھا وہ اہم کام کونسا تھا، مغیرہ بن شعبہ نے جواب دیا کہ میں لوگوں سے یزید کے لئے آپ کے انتقال کے بعد خلافت کی بیعت لے رہا تھا۔ یہ سن کر امیر معاویہ نے دریافت کیا

---

[1] معاہدہ صلح حسن کی شرط کے خلاف اقدام صریحاً عہد شکنی۔ پھر بھی عدالت محفوظ ہے!

[2] اس وقت کے لوگ ناخوش تھے تو گناہگار نہیں مگر ہم آج قابلِ اعتراض ہیں۔

تو پھر تم نے اس کام کی تکمیل کر دی۔ مغیرہ نے کہا ہاں! میں اس کام کو پورا کر چکا۔ حضرت معاویہ نے مغیرہ سے کہا تم جاؤ اور حسب سابق اپنے فرائض ادا کرتے رہو جب مغیرہ ابن شعبہ امیر معاویہ کے پاس سے واپس ہوئے تو ان کے ملنے والوں نے پوچھا کیسی گزری؟ مغیرہ نے جواب دیا کہ میں معاویہ کو ایسی دلدل میں پھنسا آیا ہوں کہ اب قیامت تک ان کا پاؤں اس سے نہیں نکل سکے گا۔"

(تاریخ خلفاء صفحہ ۳۰۱ مطبوعہ مدینہ پبلشنگ کمپنی)

منقولہ بالا بیان سے بہت سارے شکوک دور ہو جاتے ہیں اور عہد شکنی، فساد انگیزی، فتنہ پردازی جیسے شنیع امور ایسے افراد پر مکمل طور پر ثابت ہو جاتے ہیں۔ جن کو بعض لوگ ہدایت کے ستارے اور عدل و انصاف کے شہ پارے کہتے ہیں۔ اگر ان ہی لوگوں کی سیرو کردار کو نمونۂ عمل بنا لیا جائے تو یہ دنیا مجموعہ سازش اور ارضی جہنم کا ایک خطہ نظر آنے لگ جائے۔ یا ایک دلدل جس سے قیامت کے بعد بھی چھٹکارا پانا محال ہو۔

علامہ سیوطی نے محولہ بالا کتاب میں واضح الفاظ میں یزید پر لعنت کی ہے۔

"زیاد، یزید اور امام حسین رضؓ کے قاتل۔ ان تینوں پر اللہ کی لعنت۔"

(تاریخ الخلفاء صفحہ ۳۰۴)

یزیدی سماج حافظ علامہ جلال الدین سیوطی نے انتہائی محتاط، مختصر مگر جامع کلامی کے ساتھ یزیدی سماج کی تصویر کشی کی ہے۔ لکھتے ہیں کہ

"یقین ہو گیا کہ اب ہم پر آسمان سے پتھروں کی بارش ہو گی۔ کیونکہ فسق و فجور کا یہ عالم تھا کہ لوگ اپنی ماں، بہنوں اور بیٹیوں سے نکاح کر رہے تھے۔ شرابیں پی جا رہی تھیں اور لوگوں نے نماز ترک کر دی تھی۔"

اللہ، فرشتوں اور لوگوں کی لعنت کا مستحق یزید

علامہ سیوطی نے صحیح مسلم کی روایت نقل کی ہے کہ

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو شخص اہل مدینہ کو ڈرائے گا اللہ تعالیٰ اس کو ڈرائے گا اور اس شخص کے اوپر اللہ، اس کے فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت ہوگی۔" (مسلم)

اس لعنت بے شمار کا اولین مستحق معاویہ کا چشم و چراغ ابو خالد یزید ملعون ہے کہ سیوطی تحریر فرماتے ہیں۔

"۶۳ھ میں یزید کو خبر ملی کہ اہل مدینہ اس پر خروج کی تیاری کر رہے ہیں اور انھوں نے اس کی بیعت توڑ دی ہے۔ یہ سن کر اس نے ایک بھاری لشکر مدینہ کی طرف روانہ کیا اور مدینہ والوں سے اعلان جنگ کر دیا۔ یہاں لوٹ مار کرنے کے بعد یہی لشکر مکہ معظمہ حضرت ابن زبیرؓ پر لشکر کشی کے لئے بھیجا گیا۔ اور واقعہ حرّہ باب طیبہ پر واقع ہوا۔ واقعہ حرّہ جانتے ہو کیا ہے۔ اس کی کیفیت حسن مُرّہ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ جب مدینہ پر لشکر کشی ہوئی تو مدینہ کا کوئی شخص ایسا نہیں تھا جو اس لشکر سے پناہ میں رہا ہو۔ ہزار ہا صحابہ ان لشکریوں کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ مدینہ شریف کو خوب خوب لوٹا گیا۔ ہزاروں باکرہ لڑکیوں کی بکارت زائل کی گئی (ان کے ساتھ مدینۃ النبی میں زنا بالجبر کیا گیا) اناللہ وانا الیہ راجعون!"

(تاریخ الخلفاء صفحہ ۳۰۶)

مترجم تاریخ الخلفاء، ادیب شہیر حضرت شمس بریلوی اظہار تعجب کرتے ہوئے صفحہ ۳۰۷ پر حاشیہ لگاتے ہیں کہ

"لعہ یزید کے ان ناپاک اعمال کے بعد بھی لوگ کہتے ہیں کہ اس کی شان میں گستاخی نہ کرو، یا للعجب"

لیکن مشتاق کو حضرت بریلوی صاحب پر تعجب ہے کہ شاید انھوں نے لوگوں کو یہ کہتے نہیں سنا کہ یزید خلیفہ راشد و رشید بھی ہے۔ الامان

امام احمد بن حنبل کا ناطق فیصلہ

اور

اپنے فرزند کو خصوصی نصیحت

ائمہ اربعہ میں کے ایک امام اہل سنۃ احمد بن حنبل نے یزید لعہ پر لعنت کرنے کی ہدایت اور وضاحت بایں الفاظ کی جب اُن کے بیٹے نے اُن سے دریافت کیا کہ فسق و فجور کے سبب آپ یزید لعہ کو ملعون کیوں قرار دیتے ہیں۔ امام صاحب نے جواب دیا:

"اے میرے بیٹے کیا ایسا بھی ممکن ہو سکتا ہے کہ کوئی اللہ پر ایمان رکھنے کا دعویٰ بھی کرے اور پھر یزید لعہ سے بھی دوستی رکھے؟ (یعنی ناممکن ہے کہ صاحب ایمان کا صاحب یزید ملعون ہو) اور ایسے (ملعون) شخص پر میں (احمد بن حنبل) لعنت کیوں نہ کروں ہ جس پر خود اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب (قرآن) میں لعنت کی۔ میں (فرزند احمد) نے دریافت کیا خدا نے کس مقام پر اپنی کتاب میں یزید لعہ پر لعنت کی ہے۔ تو انھوں نے جواب دیا فھل عسیتم ..... کہ پھر تم سے یہ اُمید ہے کہ اگر تم کو حکومت مل جائے تو ملک

میں فساد برپا کرو گے اور قطع رحمی کرو گے ایسے ہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ کی لعنت ہے۔ پھر ان کو بہرا اور اندھا کر دیا (اس مقام پر امام احمد حنبل نے اپنے بیٹے سے فرمایا) کیا قتل امام حسینؑ سے بڑھ کر بھی کوئی فساد ہو سکتا ہے؟"

(صواعق محرقہ ابن حجر مکی صـ ۲۲۰)

حافظ ابن کثیر کی زبان سے

کردار یزید لعہ

نواصب کے چہیتے مفسر ابن کثیر دمشقی نے یزید لعہ کا چال چلن اس طرح بیان کیا ہے

"بلاشبہ مروی ہے کہ یزید اس معاملہ میں مشہور (بدنام زمانہ) تھا کہ وہ لہو و لعب کے آلات رکھتا، شراب پیتا تھا۔ گانے بجانے، شکار کھیلنے بغیر داڑھی کے لڑکوں کو رکھنے، چھینے چھینے بجانے، کتے پالنے، سینگ والے مینڈھے ریچھوں اور بندروں کو لڑانے میں مشغول رہتا تھا۔ کوئی دن ایسا گزرتا کہ اس نے شراب نہ پی ہو۔ وہ بندروں کو سجے ہوئے گھوڑوں پر سوار کر کے دوڑاتا تھا، اور بندروں کے سروں پر سونے کی ٹوپیاں سجاتا تھا۔ اسی طرح لونڈوں کے سروں پر بھی۔ وہ گھوڑوں کی ریس کراتا تھا۔ اور اگر اس کا کوئی بندر مر جاتا تھا تو اس کو بہت صدمہ پہنچتا تھا۔ یہ بیان کیا گیا ہے کہ اس کی موت یوں واقع ہوئی کہ وہ ایک بندر کو اٹھائے ہوئے تھا۔ اور اسے اچھال رہا تھا کہ اس بندر نے اس کو کاٹ لیا۔ اس کے علاوہ اس کی بہت سی برائیاں بیان کی گئی ہیں۔"

(البدایہ والنہایہ جلد ۸ صـ ۲۳۵)

علامہ ابن کثیر نے یزید لعین کو قتل حسینؑ کا مجرم قرار دیا ہے۔

علامہ ابن کثیر نے یزید کو قتلِ حسینؑ کا مجرم قرار دیا ہے۔

"اور یہ گزر چکا ہے کہ (یزید) نے حسینؑ اور ان کے ساتھیوں کو عبید اللہ ابن زیاد کے ہاتھ سے قتل کیا۔"

(البدایہ والنہایہ جلد ۸ صفحہ ۲۲۳)

اب ہم اس ملعون کی بدکرداری کا ثبوت اس کے بیٹے کی زبان سے پیش خدمت کرتے ہیں۔

یزید لعین اپنے ہی بیٹے کی نظر میں

علامہ اہلسنت دمیری اپنی کتاب "حیواۃ الحیوان" جلد ۱ صفحہ ۵۵ میں لکھتے ہیں کہ بہت علماء نے ذکر کیا ہے کہ تحقیق معاویہ بن یزید جب اپنی خلافت سے مستحق ہوا تو منبر پر چڑھا اور دیر تک بیٹھ کر حمد و ثنا الٰہی پڑھی اور خطبہ کو یہاں تک پہنچا کر کہا۔

"میرے دادا معاویہ نے اسی خلافت کے لئے اس شخص سے جھگڑا کیا جو میرے دادا سے زیادہ مستحق تھا۔ بلکہ سب ہی سے زیادہ مستحق تھا کیونکہ قرابت رسولؐ اور فضیلت میں سب پر فوقیت اور سبقت رکھتا تھا (یعنی علی علیہ السلام) تو میرا دادا اس کے برخلاف اس چیز کا مرتکب ہوا جو تم جانتے ہو۔ اور تم بھی اس کے ہمراہ اسی طریقے پر چلے جو تم لوگوں سے مخفی نہیں ہے حتیٰ کہ میرے دادا کے لئے امور خلافت کا انتظام پختہ ہو گیا۔ اور جب اس کو تقدیر مقرر کے مطابق موت کے ہاتھوں نے پکڑا تو اپنی قبر میں اکیلا اپنے اعمال میں گروی رکھا گیا۔ اور اس نے جو جو عمل کا توشہ

بھیجا ہوا تھا اس کا مزا پا لیا۔ اور اپنے ارتکاب معاصی و تعدی کا ملاحظہ کر لیا۔ پھر خلافت میرے باپ یزید لعین کی طرف منتقل ہوئی اور اس نے تمہاری سرداری کا پٹہ اپنے گلے میں محض اس حرص و ہوا کی بنیاد پر پہنا جو اس کے باپ کے دل میں تھا۔ اور میرا باپ یزید لعین اپنی بدفعلی اور اپنے نفس پر ظلم کرنے کے سبب سے خلافت اور امت محمدیؐ پر سرداری کے لائق نہ تھا۔ مگر اس نے حرص پر سوار ہو کر اپنے گناہوں کو مستحسن اور اچھا خیال کیا اور اللہ تعالیٰ سے بے خوف ہو کر اس پر بغاوت کی جس کے مقابل اس کی کوئی قدر نہ تھی یعنی اولاد رسول اللہ پر۔ تو مدت اس کی کم ہو گئی اور نشانی اس کی منقطع ہوئی۔ اور اپنے گڑھے قبر کو بار بنا کر اعمال خود کو گلے لگا کر اپنے گناہوں میں گروی ہو کر جا سویا مگر اس کے گناہوں کے نشانات دنیا میں باقی موجود رہے۔ اور جو اس نے بھیجا تھا اس کو مل گیا اور پشیمان اس وقت ہوا ہو گا کہ اسے پشیمانی کوئی فائدہ نہ دے گی پس تحقیق میں نے تو تم لوگوں کی گردنوں سے اپنی بیعت کا پٹہ نکال لیا ہے۔ پس سلام۔"

تقریباً ایسا ہی مضمون علامہ اہلسنت ابن حجر مکی نے اپنی کتاب صواعق محرقہ کے صفحہ ۱۳۴ پر تحریر کیا ہے۔ لہٰذا اس خطبہ سے ہر شخص کردار یزید لعین سے بخوبی واقف ہو جاتا ہے۔

پس ان شواہد سے صریحاً ثابت ہوتا ہے کہ یزید لعین قتل حسین علیہ السلام جیسے ناقابل معافی جرم کا مرتکب ہے اور اس کی صفائی پیش کرنا جہالت کے ساتھ ساتھ اہل بیت رسولؐ سے دشمنی رکھنا ہے۔

نواں سوال

سوال نمبر ۹:- کیا اہلبیتؑ میں ازواج رسولؐ بھی شامل نہیں جبکہ قرآن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیوی سارہؑ کو اہل کہا گیا ہے؟

جواب:- انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھرکم تطھیرا o (قرآن مجید)

ترجمہ:- سوائے اس کے نہیں کہ اللہ کا ارادہ ہے (اے نبوت کے) اہل بیت علیہم السلام تم کو ہر طرح کی نجاست سے ایسا پاک رکھے جیسا کہ پاک رکھنے کا حق ہے۔

پروردگار عالم نے فیصلہ کر دیا ہے کہ "اھل البیتؑ" وہ ہیں جو نجاست سے پاک ہیں۔ اس آیت مبارکہ میں قدرت نے یہ نہیں فرمایا کہ "پاک کرے" کیونکہ پاک کیا اسے جاتا ہے جو پہلے پاک نہ ہو، بلکہ فرمایا "پاک رکھے"۔ "انما" کا حصر یہی دلالت کرتا ہے کہ لہٰذا معلوم ہوا کہ از روئے قرآن اہل البیتؑ وہی لوگ ہیں جو سراسر طاہر و مطہر ہوں۔ چنانچہ اب ہم قرآن کی اس شرط کے مطابق تجزیہ کرتے ہیں اصحاب اور ازواج کو بھی اہلبیتؑ میں شامل کیا گیا ہے یا نہیں۔

اس سلسلے میں اوّل گذارش یہ ہے کہ "شرک" اسلامی شریعت میں نجاست کبیرہ ہے جب کہ ظاہر ہے تمام صحابہ اسلام قبول کرنے سے پہلے مشرک تھے۔ ہر ایک متعدد برائیوں میں گھرا ہوا تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ ارادہ کے ساتھ زوردار الفاظ

میں کہہ رہا ہے کہ "نجاست سے دور رکھے" اس لئے اشد ضروری ہے کہ اہل البیتؑ سے مراد وہ ہستیاں ہیں جو ہر طرح کی برائی اور آلودگی سے منزّہ ہوں۔ اور سوائے محمدؐ و آل محمدؑ کی شخصیتوں کے ایسا کوئی نہیں ہو سکتا۔ ورنہ ان کے علاوہ ثابت کر دیں کہ کسی صحابی نے اہلبیت ہونے کا دعویٰ کیا ہو۔ ہم اعتماد اور وثوق سے دعویٰ کرتے ہیں کہ کتب احادیث میں کوئی ایک بھی مرفوع حدیث ایسی نہیں ملتی کہ کسی بھی صحابی نے اہل بیت ہونے کا دعویٰ کیا ہو۔ اگر اصحاب اہل البیت ہوتے تو بارگاہ رسولؐ سے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کو تخصیص حاصل نہ ہوتی اور خصوصیت سے آنحضرتؐ جناب سلمانؓ کو یہ نہ فرماتے کہ:
"سلمان منا اھل البیت"

دوم عرض یہ ہے کہ آیت تطہیر میں ضمیر جمع مذکر "کُم" آئی ہے لیکن قرآن مجید میں جہاں حضورؐ کی بیویوں کا ذکر آیا ہے ہر جگہ ضمیر جمع مؤنث "کُن" آئی ہے۔ ورنہ کوئی ایک ہی ایسا موقعہ نشان کرا دیا جائے جہاں ازواج پیغمبرؐ کے لئے خدا نے مذکر کی ضمیر استعمال فرمائی ہو۔ جب خدا نے امہات المومنین کے گھروں کا تذکرہ کیا ہے تو وہاں "بیوتکن" کہا گیا ہے اور "بیوت" جمع ہے "بیت" کی لیکن آیت تطہیر میں "بیت" کہا گیا ہے جو واحد ہے۔ مزید یہ کہ "ال" تخصیصی استعمال کیا گیا ہے کہ "البیت"۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ اہل البیت سے مراد وہ گھر والے ہیں جن میں کثرت پاک مردوں کی ہے۔ جب کہ بات ازواج پر منطبق نہیں ہو پاتی ہے۔

قرآن پاک رسول پاکؐ پر نازل ہوا جو تشریح حضورؐ فرمائیں اس سے معتبر و مقبول اور کوئی تشریح نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا ہم بارگاہ رسالت میں التجا کرتے ہیں کہ یا رسول اللہؐ اہل البیتؑ سے مراد کون ہستیاں ہیں؟ چنانچہ ہمیں کتب احادیث میں یہ تشریح بزبان رسولؐ اس طرح ملی۔

• حضرت ام المومنین جناب ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ جب

سرکارِ دو عالم پر یہ آیت (تطہیر) نازل ہوئی تو آپؐ نے چادر لی۔ پہلے حسنؑ اور حسینؑ کو بلایا پھر فاطمہؑ اور علیؑ کو اور ان چاروں کو چادر میں لپیٹ لیا۔ میں نے عرض کیا کہ میں بھی آجاؤں لیکن آپؐ نے فرمایا کہ تم خیر پر ہو اور ہاتھ اٹھا کر اللہ سے عرض کیا۔

اللھم ھؤلاء اھل بیتی، اللھم ھؤلاء اھلی۔ یعنی اے میرے اللہ یہ ہیں میرے اہلبیتؑ۔ (مشکوٰۃ المصابیح باب مناقب اہلبیتؑ)

اس حدیث کو کم از کم پچیس ۲۵ صحابہ نے روایت کیا ہے۔ صحیح مسلم اور ترمذی میں یہ روایت بی بی عائشہ سے مروی ہے۔ ملاحظہ کیجیے ترمذی شریف ۲۲۰/۲، المستدرک حاکم ۱۴۶/۳، خصائص کبریٰ ۲۶۴/۲، اشعۃ اللمعات ۶۸۱/۴، اسد الغابہ ۱۲/۲، درمنثور ۱۹۹/۵، کبیر ۶۴۵/۶، خازن ۲۵۹/۳، اصابہ ۳۶۷/۴، الصواعق محرقہ صفحہ ۱۴۳، مدارج النبوۃ ۳۶۴/۲، اور دیکھیے مسند احمد بن حنبل، النسائی، طبرانی وغیرہ وغیرہ اور حاشیہ مترجم قرآن مجید جناب مولوی اشرف علی تھانوی۔

مندرجہ بالا حوالہ جات کے مطالعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ آیہ موصوفہ کے متعلق سرکارِ دو عالمؐ نے اہل البیتؑ سے مراد حضرت علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ اور حسینؑ علیہم السلام ہی کو فرمایا ہے۔

غیر شیعہ مفسرین کی کثیر تعداد کی یہی رائے ہے کہ یہ آیہ پنجتن پاکؑ کی شان ہی میں نازل ہوئی۔ کچھ لوگوں نے اس سے مراد صرف آنحضرتؐ کی ذاتِ اقدس مانی ہے۔ اور کچھ لوگوں نے ازواج کو اس میں شامل کرنا ضروری سمجھا ہے لیکن سوائے ناصبی اور خارجی کے کسی ایک بھی مسلمان نے پنجتن پاک علیہ السلام کو اس آیت سے باہر بیان نہیں کیا ہے۔

صحیح مسلم کی روایت کے مطابق آنحضرتؐ نے ان چار نفوس کو چادرِ تطہیر میں لے کر یہ دعا فرمائی:

اللھم ھؤلاء اھل بیتی وخاصتی اذھب عنھم الرجس

وطھرھم تطھیرا۔"

یعنی یارب یہ میرے اہلبیتؑ اور میرے مخصوصین ہیں ان سے رجس کو دور رکھ جیسا کہ دور رکھنے کا حق ہے۔

اس روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر بالفرض محال پنجتن پاکؑ کے علاوہ کسی دوسرے کو اہل بیت میں تسلیم کر لیا جائے تب بھی لفظ "خاصتی" کی تخصیص اسے حاصل نہیں ہو سکتی۔ اور کملی میں آنے والے چاروں نفوسِ قدسیہ تمام کائنات سے ایک خاص اور علیحدہ شان کے مالک ہیں۔ کیونکہ حضورؐ صاحبِ قرآن ہیں جس کے لئے جو چاہیں اعزاز مخصوص فرما دیں کہ آپؐ مالک اور صاحبِ اختیار ہیں۔ اگر آپ لوگ آیت کا مصداق سب گھر والے سمجھیں پھر بھی چادر میں بلا کر صرف اور صرف چار ہستیوں کے انتخاب رسولؐ کی تخصیص کو کسی بھی طریقے سے توڑا نہیں جا سکتا ہے۔ اسی لئے مجبوراً آپ خود بھی ان حضرات کو آلِ عبا یعنی چادر میں آنے والی آل کہتے ہیں۔

اگر تفسیر ثعلبی کی ضعیف حدیث کا ذکر کیا جائے کہ اہل بیت سے تمام بنی ہاشم مراد ہیں کیونکہ حضورؐ نے حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ اور ان کی صاحبزادیوں کو بھی چادر میں لپٹا کر دعا فرمائی تو مناسب ہے کہ وہ دعا بھی نقل کر دی جائے تاکہ شبہ کا ازالہ ہو سکے۔

یارب ھذا عمی وصنوابی وھؤلاء اھل بیتی فاسترھم من النار کستری ایاھم بملئی ھذہ فامنت اسکفۃ الباب و حوائط البیت۔

"یعنی یارب یہ میرے چچا اور بمنزلہ میرے والد کے ہیں۔ یہ میرے اہلبیت ہیں انہیں آتشِ دوزخ سے ایسا چھپا جیسا میں نے اپنی چادر میں چھپایا ہے۔"

اس دعا سے صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ حضورؐ نے حضرت عباسؓ اور

ان کے گھر والوں کو آتشِ جہنم سے محفوظ رہنے کی دعا فرمائی۔ اس میں طہارت اور تخصیص کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ حالانکہ اس روایت کو خود سُنّی علماء نے صحیح تسلیم نہیں کیا ہے۔

اسی طرح بعض کا خیال ہے کہ حضورؐ نے دیگر رشتہ داروں کو چادر سے تو باہر رکھا لیکن ازواج اور دوسرے رشتہ داروں کو حکماً اہل بیت میں شامل کیا۔ لیکن میں کہتا ہوں جو اعزاز "خاصتی" کا ان پنجتن پاکوں کو نصیب ہوا وہ کسی دوسرے کو نہ مل سکا۔ گھر والے سارے سہی لیکن مخصوص کہ جن کو طہارت کاملہ حاصل ہے وہ پنجتن پاکؑ کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے اور یہ ایسا ٹھوس دعویٰ ہے کہ جسے ہلایا تک نہیں جا سکتا۔

اوّل بیان کردہ حدیث ثابت کرتی ہے کہ ازواجِ رسولؐ آیتِ تطہیر میں داخل نہیں ہیں۔ اگر ہوتیں تو حضورؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت اُمِ سلمہؓ کو نورانی چادر میں آنے کی اجازت دے دیتے۔ حضورؐ کا منع فرما کر ام المومنینؓ کو خیر پر ہونے کی خبر دینا دلیل ہے کہ ازواجِ رسولؐ اہلبیتؑ طاہرین میں نہیں ہیں۔ صحیح بخاری وغیرہ میں ایک نہیں کئی روایتیں موجود ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ازواجِ رسولؐ حیض سے مبرّا و منزّا نہیں حالانکہ حیض کو قدرت نے نجاست کہا ہے۔ اور آیتِ تطہیر کے مطابق اہل بیتؑ کا نجاست سے پاک رہنا ضروری ہے۔

لیکن بی بی سیدۃ النساءؑ فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کو اللہ نے نجاست سے پاک رکھا۔ اسی لئے آپؑ کو "بتول" کہا جاتا ہے۔ کہ اس کے یہی معنی رسول اللہؐ نے خود بتائے ہیں۔ دیکھئے کتب اہل سنت، مستدرک حاکم طبرانی شریف، ارجح المطالب سیرۃ الفاطمہ اور شان حبیب الرحمٰن مصنفہ مفتی اہلسنت احمد یار خان بدایونی خطیب جامع غوثیہ گجرات وغیرہ وغیرہ۔

ہمارا ایمان ہے کہ اللہ ایسا پاک کرنے پر قادر ہے جو عیسیٰؑ کو بغیر باپ

کے پیدا کرنے والا اور بی بی سارہ علیہا السلام کو بڑھاپے میں اسحٰق علیہ السلام عطا کرنے والا خدا ہے۔

حضورؐ کی یہ حدیث متعدد کتب اہلسنت میں موجود ہے کہ اہل بیتؑ پر صدقہ حرام ہے۔ ملاحظہ ہو بخاری، ترمذی، مشکواۃ اور مطالب السئول وغیرہ مشکواۃ شریف میں یہ حدیث بھی ہے کہ جب حضورؐ کے سامنے ہدیہ پیش کیا جاتا تو خود کھاتے اور اہلِ بیتؑ کو کھلاتے۔ لیکن جب صدقہ آتا تو خود نہ کھاتے بلکہ اصحاب سے فرماتے کہ تم کھالو۔ جس سے ثابت ہوا کہ اصحاب اہل بیتؑ نہیں۔ اگر صحابہ اہل بیت ہوتے تو حضورؐ ان کو صدقہ کھانے کی اجازت نہ دیتے کیونکہ صدقہ اہل بیت پر حرام ہے۔ جب نصرانیوں سے مباہلہ ہوا تو آیہ مباہلہ میں حکم ہوا کہ کہہ دو ان سے تم اپنے بیٹے لاؤ۔ عورتیں اور نفس لاؤ اور ہم اپنے بیٹے عورتیں اور نفس لاتے ہیں اور جھوٹوں پر لعنت طلب کریں۔ مترجم قرآن مجید اشرف علی تھانوی برحاشیہ موضح القرآن عبدالقادر محدث اہلسنت، حافظ ڈپٹی نذیر احمد کی تفسیر میں، صحیح بخاری، مسلم، ترمذی، ابن ماجہ حاکم وغیرہ ہے کہ رسولِ خداؐ اپنے بیٹوں کے لئے (ابناءنا) حسنین علیہما السلام عورتوں کے لئے (نساءنا) حضرت فاطمہؑ اور انفسنا کے مطابق حضرت علی علیہ السلام کو لے کر میدانِ مباہلہ میں تشریف لے گئے۔ [حا]

آیۃِ مودّت نازل ہوتی ہے۔ اے پیغمبرؐ کہہ دو کہ میں کچھ نہیں چاہتا اجرِ رسالت تم سے بجز اپنے قرابتداروں کی مودّت کے۔ اصحاب سوال کرتے ہیں کہ یا رسول اللہؐ وہ کون قرابتی ہیں جن کی محبت ہم پر اس آیت میں فرض کی گئی ہے تو ارشاد فرمایا وہ علی علیہ السلام، فاطمہ علیہا السلام، حسن علیہ السلام

حا دورِ حاضر میں ناصبی خیال ہے کہ مباہلہ ہوا ہی نہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ خدا سے پوچھو اگر مباہلہ نہیں ہوا تو آیت نازل کیوں کر دی؟

اور حسین علیہ السلام ہیں۔

(تفسیر کبیر فخر الدین رازی جلد نمبر ۷ صفحہ ۳۹۱ صواعق محرقہ صفحہ ۱۱۸ وغیرہ)

مندرجہ بالا تصریحات سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ "اہل البیت" کون ہیں۔ جن کو خدا اور رسولؐ نے مخصوص و منصوص فرمایا۔ اب ان کی شان دیکھیے کہ ارشاد نبویؐ ہے کہ میرے اہل بیتؑ کی مثال سفینۂ نوحؑ کی طرح ہے جو اس میں سوار ہو گیا، نجات پا گیا اور جو رہ گیا ہلاک ہو گیا۔

آئیے! اس کشتی میں سوار ہو جائیے اور ہلاکت سے بچ جائیے۔ یار لوگ کہتے ہیں کہ کشتی ستاروں کی مدد سے چلتی ہے اور رسولؐ کے صحابی ستارے ہیں۔

اصحابی کالنجوم

لہٰذا کشتی کے منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے ستاروں کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کی تصدیق قرآن بھی کرتا ہے۔

بلاشبہ ہم بھی اس حقیقت کو فراموش نہیں کرتے ہیں کہ از روئے قرآن صرف ایک ستارا (قطب تارہ) رہنمائی کا نشان ہے، جیسا کہ لفظ واحد "النجم" استعمال ہوا ہے اور فی الحقیقت جہاز ران آسمان کے سارے ستاروں کی مدد نہیں لیتے جو کہ اپنی جگہ تبدیل کرتے رہتے ہیں بلکہ اس ستارے کی مدد لیتے ہیں جو اپنے مقام پر قائم رہے۔ لیکن سفینۂ نوحؑ کے لئے علیؑ جیسا قطب تارا موجود ہے تاکہ کسی دوسرے ستارے کی احتیاج نہ رہے۔

اور پھر حدیث میں اہل بیتؑ کو مثل سفینۂ نوح علیہ السلام کہا گیا ہے نوحؑ کی کشتی خدا کی نگرانی میں چل رہی تھی اور اوپر تلے پانی ہی پانی تھا۔ ستارے وغیرہ دکھائی نہیں دے رہے تھے لہٰذا کشتیٔ نوحؑ ستارے کی محتاج نہ تھی۔ اور

پھر اہل بیتؑ کے گھر تو ستارے خود اتر آتے ہیں۔ دیکھیے الحلیہ حافظ[ح] ابو نعیم صلہ

علاوہ ازیں روایت "اصحابی کالنجوم" کو خود علمائے اہل سنت نے موضوع کہا ہے۔ ابو حیان اپنی تفسیر میں موضوع کہتے ہیں۔ ابن حزم رسالۃ الکبریٰ میں اسے مکذوب موضوع اور باطل لکھتے ہیں۔ علامہ سبط ابن جوزی اپنی کتاب "علل متناہیہ فی الاحادیث الواہیہ" میں اسے غیر صحیح تحریر کرتے ہیں۔ ملّا نظام الدین نے اپنی کتاب "صبح صادق شرح منار" میں اس کو موضوع قرار دیا ہے۔ اس حدیث کے راوی عبد الرحیم کو یحییٰ ابن معین کذاب لکھتے ہیں۔ علامہ ابن جوزی نے نعیم کو مجروح کہا ہے۔ ایسے راویوں کی روایت ہے اصحابی کالنجوم۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "میں تم میں دو گرانقدر چیزیں چھوڑے جاتا ہوں۔ ایک قرآن اور دوسرے میری عترت میرے اہلبیتؑ۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے کبھی جدا نہ ہوں گے۔ اگر ان کو مضبوطی سے پکڑے رکھو گے تو میرے بعد ہرگز گمراہ نہ ہو گے۔"

تب ہی تو ہمارا ایمان ہے کہ کتاب اللہ کتاب صامت ہے۔ اور آلِ محمدؐ قرآن ناطق ہیں۔ دیکھیے سر اقدس نیزے پر تھا۔ اور زبان مبارک تلاوت کر رہی تھی۔ (ابن عساکر، احمد بن حنبل۔ ابو نعیم وغیرہ)

یہ بات کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

(اقبالؔ)

[ح] لفظ حافظ کے معنی اصول حدیث کی کتب میں یوں مرقوم ہیں یعنی حافظ حدیث کے جسے ایک لاکھ احادیث حفظ ہوں وہ حافظ ہے۔

اہل البیتؑ طاہرینؑ کی یہ شان ہے وہی وہ مقدس ہستیاں ہیں جن کی طرف زمانہ کوئی بُری نسبت نہیں دے سکا۔ ان ہی ذواتِ مقدس کا پاکیزہ کردار تفسیر قرآن کا مصداق قرار پاسکتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیوی کے اہل ہونے کے متعلق میرا یہ کہنا ہی کافی ہے کہ آپ بحیثیت زوجہ اہل میں شامل نہ تھیں۔ بلکہ جناب سارہؑ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نسب لحاظ سے اہل قرار پائیں کیوں کہ ان کا نسب جناب خلیل علیہ السلام کے نسب میں شامل ہو جاتا ہے۔ نیز یہ کہ آپؑ کے شکم مبارک سے پاک نبیوں علیہم السلام کا ظہور ہوا۔ اور آپؑ بحیثیت نبیؑ کی والدہ کے اہل قرار پاتی ہیں۔ ورنہ نوح علیہ السلام لوط علیہ السلام اور دیگر انبیا علیہم السلام کی بے اولاد ازواج کو اہل کیوں نہیں کہا گیا۔ اگر کوئی مثال ہے تو بتا دیجئے۔

اہلبیتؑ اور ازواج

میں فرق

بجواب

حقیقی اہل بیت رسولؐ

"کیا ازواج النبیؐ اہلبیت اطہارؑ میں شامل ہیں؟"
اس سوال کا مفصل و مسکت جواب ملاحظہ فرمائیں۔

دسواں سوال

سوال ۱۰: تم نماز ہاتھ کھول کر کیوں پڑھتے ہو۔ اور "علی ولی اللہ" کیوں کہتے ہو؟

جواب ۱۰: جب کوئی غیر مسلم دیکھے کہ مسلمان آج تک یہ فیصلہ بھی نہ کر سکے کہ رسولؐ ہاتھ کھول کر نماز پڑھتے تھے یا باندھ کر، تو ذرا خود ہی احساس کیجئے کہ اس پر کیا اثر پڑے گا۔ اعلانِ نبوت کے بعد سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ۲۳ سالہ زندگی مسلمانوں کے درمیان گذاری۔ اس ۲۳ سال کے عرصے میں حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے کم و بیش سات لاکھ مرتبہ مسلمانوں کے سامنے حالتِ نماز میں ہاتھوں کی کیفیت واضح فرمائی لیکن افسوس ہے کہ پھر بھی نماز میں ہاتھ کھولنے یا باندھنے کے بارے میں مسلمانوں میں اختلاف دور نہیں ہو سکا ہے۔ لیکن اس اختلاف کو خلوص نیت سے بڑی آسانی سے دُور کیا جا سکتا ہے۔ اللہ نے فرمایا ہے کہ اگر تم میں باہمی اختلاف ہو جائے تو معاملہ کو خدا اور اس کے رسولؐ کی طرف لوٹا دو۔ خدا کی طرف لوٹانا یہ ہے کہ کتاب خدا کی طرف رجوع کیا جائے اور رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی طرف لوٹانے کا مطلب ہے کہ سنّت رسولؐ کی اتباع کی جاوے۔ لہٰذا اس معاملہ کو بھی اگر خدا اور رسولؐ کے سپرد کر کے ہدایت حاصل کرنے کی کوشش کی جاوے تو بہت آسانی سے قابلِ قبول حل تلاش کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ یہ جھگڑا ہم سب سے پہلے بحضورِ خداوندی پیش کرتے ہیں اور کتاب ہدایت سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔

اے قرآن کو کافی کہنے والو! ذرا بتلایئے تو سہی کہ قرآن میں کہاں لکھا ہے کہ نماز میں ہاتھ باندھے جائیں؟ اگر قاصر رہیں تو رسولِ خداؐ کے فیصلے پر عمل کریں جن کے متعلق ارشادِ ربانی ہے کہ "پھر قسم ہے آپؐ کے رب کی یہ لوگ ہرگز ایمان والے نہیں ہو سکتے جب تک کہ یہ آپس میں جو جھگڑا واقع ہو اس میں آپؐ سے تصفیہ نہ کرائیں پھر آپؐ کے فیصلے سے دلوں میں تنگی نہ پائیں اور پورے طور پر تسلیم کریں اور آپؐ کے اس فیصلہ کو دل و جان سے تسلیم کریں۔

(سورۃ النساء پ۵ ع۶۵)

چنانچہ حکمِ رسولؐ یہ ہے کہ انی تارک فیکم الثقلین کتاب اللہ وعترتی اہلبیتی ..... الخ یعنی میں تم میں دو گرانقدر چیزیں چھوڑے جاتا ہوں ایک اللہ کی کتاب اور دوسرے میری عترت میرے اہلبیت علیہم السلام اگر تم دونوں کو مضبوطی سے پکڑے رہو گے تو کبھی گمراہ نہ ہو گے۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے کبھی جدا نہ ہوں گے۔

پس اتباعِ حکمِ رسولؐ کے مطابق ہمیں چاہیئے کہ نماز کا طریقہ تعلیماتِ اہلبیت علیہم السلام ہی سے معلوم کریں۔ کیونکہ تمام علوم اہل بیتؑ کے گھر سے ہی نکلے ہیں۔ جیسا کہ مولوی شبلی نعمانی نے "سیرۃ النعمان" میں لکھا ہے کہ "ابو حنیفہ لاکھ مجتہد و فقیہہ ہوں لیکن فضل و کمال میں انہیں امام جعفر صادقؑ سے کیا نسبت؟ کیوں کہ تمام علوم اہل بیتؑ کے گھر سے نکلے ہیں۔" اس دعوٰی کو ہم نے سائنس و فن کی روشنی میں اپنی تصنیف "صرف ایک راستہ" میں بالوضاحت پیش کیا ہے کہ کائنات کے جملہ مادی و روحانی مسائل کا واحد حل تمسک بالثقلین ہے۔

میرا دعوٰی ہے کہ نہ ہی نماز میں ہاتھ باندھنا قرآنِ مجید سے ثابت ہو سکتا ہے اور نہ ہی یہ عمل احادیثِ رسولؐ سے پایۂ ثبوت کو پہنچتا ہے۔ اہل سنت حضرات کی

کتابوں میں ہاتھ باندھنے سے متعلق صرف نو (۹) روایات منقول ہیں۔ میں علمائے اہلِ سُنّت کو محبّت سے دعوت دیتا ہوں کہ وہ ثابت کریں کہ سرکارِ دو عالمؐ نے ہاتھ باندھ کر نماز پڑھی ہو یا ایسا کرنے کا مسلمانوں کو حکم دیا ہو۔ لیکن ضروری ہے کہ حدیث صحیح مرفوع ہو اور اصولِ اہلسنت ہی کے مطابق اس کے راوی ثقہ ہوں اور ان کا بیان روایتاً و درایتاً درست ہو۔ انشاء اللہ میرا یہ سوال ہمیشہ لاجواب رہے گا۔

یاد رکھیئے! نمازی اللہ کا سپاہی ہوتا ہے۔ اور اس بات پر سب متفق ہیں کہ "محراب" کے معنی "میدانِ جنگ" ہیں۔ اب ذرا غور فرمائیں اگر کسی فوجی سپاہی کو اس کا آفیسر ATTENTION کہے تو اس کی پوزیشن کیا ہو گی؟ اگر وہ پیٹ کو پکڑے گا تو یہ حرکت قابلِ اعتراض ہو گی۔ اسی طرح "اقیموا الصلوٰۃ" میں واضح حکم ہے کہ نماز میں سیدھے کھڑے ہو جاؤ اور اگر ہمارے ہاتھ بھی سیدھے نہیں تو نماز کا طریقہ درست کیوں کر ہو گا؟

اگر طریق نماز کا فیصلہ صرف قرآنی لفظ "اقامہ" ہی پر کر لیا جائے تو مزید کسی بحث کی ضرورت ہی نہیں رہتی ہے کہ اس لفظ کے معنے ہی "سیدھا کرنے" کے ہیں جیسا کہ سورہ کہف پ۱۶ آیت ۷۷ میں یہی لفظ حضرت خضرؑ کے دیوار کو سیدھا کرنے کے لئے اللہ نے استعمال فرمایا۔

لغت میں اس لفظ کے عام معنی "سیدھا کھڑا کرنا" "ٹیڑھا پن دور کرنا" "ہمیشہ کے لئے سیدھا کرنا" "ہمیشہ قائم رکھنا" وغیرہ وغیرہ ہیں۔ اسی سے زاویہ قائمہ ۹۰ ہے جو کہ سیدھا ہوتا ہے۔ اب جب قیام میں ہی آدمی سیدھا نہ ہے تو باقی نماز کی درستگی کا کیا اعتبار؟

اسلام دینِ فطرت ہے اور نماز اس فطرت کا ایک رکن۔ فطرۃً انسان کے ہاتھ کھلے رہتے ہیں۔ لہٰذا نماز میں ہاتھ باندھنا غیر فطری ہے کیونکہ اگر پوچھا

جائے کہ بجائے نماز میں ہاتھ کیوں باندھے جاتے ہیں تو اس کا نہ ہی کوئی نقلی جواب ہے اور نہ ہی عقلی جب انسان کوئی خلافِ فطرت فعل کرے تو اس کی کوئی وجہ ضرور ہونا چاہیے۔

چونکہ نماز افضل عبادت ہے اور اس کی ہر ایک کیفیت خدا کی مقررہ و پسندیدہ ہے لہٰذا غیر فطری کیفیت و حالت اللہ کی پسندیدہ نہیں ہے۔ چنانچہ خداوند تعالیٰ فرماتا ہے ـــــ

"کیا تو نے اتنا بھی نہیں دیکھا کہ جتنی مخلوقات سارے آسمانوں اور زمین میں ہے اور پرندے بازو کھول کر اس کی تسبیح کیا کرتے ہیں۔ سب کے سب اپنی نماز اور تسبیح (کا طریقہ) خوب جانتے ہیں۔ اور خدا جو کچھ یہ کیا کرتے ہیں اس سے خوب واقف ہے۔" (سورۃ النور آیت ۴۱ پ ۱۸)

آیت مذکورہ بالا سے بالوضاحت ثابت ہوتا ہے کہ نماز کا فطری اور نقلی طریقہ ہاتھ کھول کر پڑھنا ہے جو کہ قرآن مجید سے بھی ثابت ہے۔ لیکن نماز ہاتھ باندھ کر پڑھنا قرآن اور فطرت سے پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اہل سنت حضرات کی اکثریت کا مذہب یہ ہے کہ ہاتھ باندھ کر یا کھول کر نماز پڑھی جا سکتی ہے۔ اور یہ دونوں طریقے درست ہیں۔ چنانچہ اہلسنت مفتی لبصیر ماہنامہ "البصیر" کراچی اپنے عنوان "نورِ ہدایت" کے تحت مسٹر خلیق اللہ خان صاحب از بہاولپور کو مندرجہ ذیل سوال کا جواب حسب ذیل تحریر کرتے ہیں۔

سوال:۔ شیعہ حضرات نماز میں ہاتھ چھوڑ کر کھڑے ہوتے ہیں۔ سنی حضرات ہاتھ باندھ کر نماز پڑھتے ہیں۔ اہلِ حدیث نماز پڑھتے وقت سینے پر ہاتھ باندھتے ہیں۔ ان تمام طریقوں میں فرض

کیا ہے؟ ہاتھ چھوڑ کر نماز پڑھنا یا ہاتھ سینے پر یا ناف پر باندھ کر نماز پڑھنا؟

جواب:۔ اس قسم کے اختلافی مسائل سے جن کا تعلق اصولِ دین سے نہیں بلکہ فروعات سے ہے۔ کوئی فائدہ نہیں۔ نماز میں قیام محض فرض ہے۔ یعنی کسی سہارے کے بغیر سیدھا کھڑا ہونا۔ سینے پر ہاتھ باندھنا یا زیر ناف باندھنا یا ہاتھ چھوڑ کر ان میں کوئی طریقہ فرض نہیں بلکہ سنت ہے اور ہر مکتبۂ فکر کے علما ہاتھ کسی خاص مقام پر باندھنے اور کھلا چھوڑ دینے کا استدلال احادیث ہی سے کرتے ہیں۔ (لہٰذا کسی طریقہ کو بھی برا نہیں کہنا چاہیئے۔ ہاتھ چھوڑ کر نماز پڑھنا محض شیعہ حضرات تک محدود نہیں) بلکہ اہل سنت والجماعت بھی حضرت امام مالکؒ کے پیرو ہاتھ چھوڑ کر نماز پڑھتے ہیں صرف اہل حدیث حضرات نہیں بلکہ اہل سنت بھی حضرت امام حنبلؒ کے پیرو (جن میں حضور غوث الثقلین غوث الاعظم بھی شامل ہیں) سینے پر ہاتھ باندھتے ہیں۔ شافعی حضرات میں بالائے ناف اور حنفی حضرات میں زیر ناف ہاتھ باندھنے کا طریقہ افضل سمجھا جاتا ہے۔ لہٰذا اس سوال پر بحث و تکرار کی ضرورت نہیں۔" (ماہنامہ "البصیر" کراچی رسول پاک نمبر جلد دوم اکتوبر ۱۹۷۴ء صفحہ ۴۵)

مخالف عقلی دلیل

معلوم ہوا کہ اہل سنت والجماعت کے نزدیک ہاتھ کھول کر نماز پڑھنا معیوب نہیں ہے۔

لیکن مولوی کرم دین دبیر نے اپنی کتاب "آفتاب ہدایت رد رفض و بدعت" میں اپنی انوکھی تحقیقات پیش کی ہیں۔ لہٰذا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس کا تجزیہ کر کے قائم کردہ دلائل کو باطل ثابت کیا جائے۔

مولوی صاحب کتاب مذکورہ کے صفحہ ۲۳۸ پر عقلی دلیل بیان کرتے ہیں کہ "طریق عجز و نیاز یہی ہے کہ دست بستہ کھڑے ہو کر اپنے رب العباد کے سامنے عرض و معروض کیا جائے۔ ہاتھ کھول کر لٹکا کر کھڑا ہونا ہرگز طریق ادب

نہیں ہے۔ تم دیکھتے ہو معمولی انسان تو حکام و امراء کے سامنے بھی پیش ہو کر ہاتھ باندھ کر عرض کیا کرتے ہیں۔ ہر ایک شاہی دربار کا یہی آئین ہے۔ غلام و خدمت گار اور پیش کار وغیرہ دست بستہ کھڑے رہتے ہیں۔ . . . . . کوئی قاصد کسی بزرگ کی طرف بھیجا جائے تو کہا جاتا ہے کہ میری طرف سے ہاتھ باندھ کر عرض کر دینا۔ پھر جب اعلیٰ سرکار احکم الحاکمین کے دربار میں دینی و دنیوی برکات حاصل کرنے کی تمنا میں کھڑے ہو کر نماز پڑھنے لگیں تو عرفاً و اصطلاحاً و شرعاً طریق ادب یہی ہے کہ ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوں۔ یہ کوئی طریق ادب نہیں ہے کہ ہاتھ کھولے ہوئے اکڑ کر کھڑے ہو جائیں۔ بلکہ یہ حد درجہ کی گستاخی ہوگی۔ خضوع و خشوع اور قنوت اسی میں متصور ہے کہ ہاتھ باندھ کر نماز پڑھیں۔ ہاتھ کھولے ہوئے اکڑ کر سیلوٹ کرنا نصاریٰ کا آئین ہے۔ اسلامی طریق اس سے جدا ہونا چاہیے۔"

تردید کیونکہ مولوی صاحب نے یہ عبارت عقلی دلیل کے تحت لکھی ہے لہٰذا اس کا عقلی جواب یہ ہے کہ

(۱) آج کے دور میں ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونا عجز و نیاز کی علامت نہیں ہے۔ کیونکہ مشاہدہ گواہ ہے کہ جب کبھی سلامی پیش کی جاتی ہے تو ہاتھ نہیں باندھے جاتے بلکہ لٹکائے جاتے ہیں۔ اگر کہا جائے کہ یہ طریقہ انگریزوں کا ہے تو ہم کہیں گے کہ فی زمانہ تمام دنیا میں رائج ہے اور انگریز عیسائی ہیں۔ اہل کتاب ہیں۔ جب کہ ہاتھ باندھنا مجوسیوں اور آتش پرستوں کا طریقہ ہے جو کہ اہل کتاب نہیں ہیں۔

(۲) "دست بستہ" کے معنی پیٹ پر ہاتھوں کا باندھنا نہیں ہے بلکہ اظہار معذرت کے لیے "ہاتھوں کا جوڑنا" ہے جیسے کہ معافی مانگی جاتی ہے۔ اور اہل تسنن کا یہ شعار نہیں ہے لہٰذا اگر دست بستگی ہی عجز و نیاز ہے تو ہاتھ جوڑ کر

کھڑا ہونا چاہیے جس طرح اہل ہنود پوجا کرتے ہیں۔ نہ کہ پیٹ کو پکڑنا چاہیے یا ناف کو تھام لینا چاہیے۔

(۳) عجز و نیاز کا تعلق قلب و ذہن سے ہوتا ہے اسی لیے رونا خشوع کو بڑھاتا ہے۔ ہاتھ باندھنا عجز و نیاز سے تعلق نہیں رکھتا۔ چونکہ نمازی اللہ کا سپاہی ہوتا ہے لہٰذا اسے چاک و چوبند ہونا چاہیے نہ کہ سست و غافل۔ اور موجودہ فوجی قواعد کی رو سے ہاتھ باندھنا ڈھیلے پن اور سستی کی علامت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حالت نشہ میں اور نیند و غنودگی میں نماز پڑھنا معیوب ہے بلکہ ہمارے نزدیک نماز میں آنکھیں بند کرنا بھی اچھا نہیں سمجھا جاتا ہے۔ چونکہ ہاتھ باندھ کر کھڑا ہونا مشاہداتی لحاظ سے بیمار ہونے، مجرم و ملزم ہونے اور سست و کاہل ہونے کے مذموم تاثرات کا احتمال پیدا کرتا ہے لہٰذا یہ حالت نماز کے لیے عقلاً درست نہیں ہے لیکن بیماری، نشہ و کاہلی، نیند وغیرہ کی صورتوں میں نماز درست نہیں۔

(۴) مولوی صاحب کہتے ہیں کہ ہاتھ کھول کر اکڑ کر کھڑا ہونا ہرگز طریق ادب نہیں ہے خلاف مشاہدہ ہے کیونکہ آج کل جب کبھی بھی کسی سربراہ کو سلامی دی جاتی ہے ہاتھ کھول کر اکڑ کر کھڑا ہو کر دی جاتی ہے۔ اور پھر خود مولوی صاحب نے آگے عقلی دلیل میں "انحر" سے استدلال کیا ہے جس کے معنی سینہ تان کر سیدھا کھڑا ہونا ہیں۔

(۵) ساری دلیل کا انحصار "دست بستگی" پر ہے اور اس کے معنی ہاتھ جوڑنا ہے۔ لہٰذا روح دلیل ہی مردہ ہے۔ پس پوری دلیل مردود اور باطل ہے ورنہ ثابت کیا جائے کہ "دست بستہ" سے مطلب پیٹ یا سینہ پر ہاتھ باندھنا ہے۔

مخالف نقلی دلیل ۱ مولوی صاحب کتاب مذکورہ کے صفحہ ۲۲۹ میں نقلی دلیل اس طرح بیان کرتے ہیں:-

"فصل لربک وانحر" (خدا کی نماز ہاتھ باندھ کر پڑھ) نحر کے معنی لغت میں ہاتھ باندھنے کے بھی ہیں۔ چنانچہ علم لغت کی سب سے مستند اور متداول کتاب قاموس جلد اول صفحہ ۳۲۲ میں باب الراء فصل نون میں ہے، نحر الرجل فی الصلوٰۃ و نہر صدرہ او وضع یمینہ علیٰ شمالہ (نماز میں نحر کا معنی یہ ہے کہ سینہ قبلہ رو سیدھا کرکے یا دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر باندھ کر کھڑا ہو۔ علم لغت سب کے لئے یکساں حجت ہے۔ اس سے کسی کو انکار کی گنجائش نہیں ہے۔ آیت فصل میں چونکہ نماز پڑھنا صاف قرینہ موجود ہے اس لئے یہاں نحر کے معنی یہی ہے کہ داہنا ہاتھ بائیں ہاتھ پر رکھ کر ہاتھ باندھے ہوئے نماز پڑھو۔"

تردید علمائے اہلسنت کی کثیر تعداد نے اس آیت مبارکہ میں "انحر" سے مراد قربانی لی ہے تاہم چونکہ مولوی صاحب نے لغت کو بنیاد قرار دیا ہے ہم ان ہی کی اساس پر گفتگو کرتے ہیں۔

۱۔ آیت "فصل لربک وانحر" کا ترجمہ "خدا کی نماز ہاتھ باندھ کر پڑھو" لغوی اعتبار سے بھی غلط اور محرف ہے اور مولوی صاحب نے آیت میں معنوی تحریف کرنے کا سنگین جرم کیا ہے اگر بقول مولوی صاحب "انحر" کو ہاتھ باندھنے کے معنی میں بھی لے لیا جائے تو بھی آیت کا ترجمہ اس طرح ہوگا "اپنے رب کی نماز پڑھ اور ہاتھ باندھ" مولوی صاحب نے "وَ" کا ترجمہ نہ کرکے جو تحریف کی ہے وہ بھی ان کے لئے مفید ثابت نہیں ہو سکی معیت بھی نہیں بنتی ہے۔

کیونکہ اگر مولوی کے بیان کردہ معنی مان لئے جائیں تو حسن کلام برقرار نہیں رہتا ہے اور فقرہ بے معنی ہو جاتا ہے کیونکہ اگلی آیت یہ ہے کہ "انا شانئک ھو الابتر" کہ بے شک تیرے دشمن ابتر ہیں۔ اب

ترجمہ اس طرح ہوگا۔

"اپنے رب کی نماز پڑھ اور ہاتھ باندھ بے شک تیرا دشمن ابتر ہے۔"

نماز پڑھنے کے بعد ہاتھ باندھنے کا ذکر کرنا علم الکلام کے لحاظ سے درست نہیں ہے کیونکہ اگر اس طرح ہوتا کہ "ہاتھ باندھو اور نماز پڑھو" تو بھی بات معقول تھی لیکن چونکہ کلام خدا غلطیوں سے پاک ہے لہٰذا مولوی صاحب کا ترجمہ ہی غلط ماننا پڑے گا۔

۲۔ قاموس میں دو (۲) معنی بیان ہوئے پہلا "ونہر صدرہ" یعنی سینہ ابھار کر چھاتی تان کر کیونکہ "نہر" کے معنی ابھرنا، اٹھنا ہیں اور دوسرے دائیں کو بائیں پر دھرنا۔ دونوں میں سے ایک معنی مفہوم ہوگا۔ آیت کا نفسِ مضمون ثابت کرتا ہے کہ خدا اپنے رسولؐ کو دشمن کے مقابلے میں ابھارنا چاہتا ہے۔ اسے غلبۂ رسولؐ مقصود ہے۔ لہٰذا اگلی آیت جس میں دشمن کو ابتر کیا گیا ہے اس کے ساتھ رسولؐ کو غالب کر دینا ہی موزوں ہوگا۔ اور اس طرح ترجمہ ہوگا کہ:

"نماز پڑھ اپنے رب کی اور نماز میں سینہ تان کر کھڑا ہو۔ (افسردہ خاطر نہ ہو) بے شک تیرا دشمن ابتر ہے۔" یہی معانی "نحر" کے مشہور اور معروف ہیں۔ ملاحظہ کیجیے "بیان اللسان" صفحہ ۸۲۰ نحر کے معنی سینے کا بالائی حصہ، گردن بند کی جگہ، "نحر النہار" دن کا شروع حصہ "نحر الشہر" اول مہینہ (ف) ذبح کرنا، سینہ پر نیزہ مارنا، دو گھروں کا آمنے سامنے ہونا (نہ کہ ملے ہونا) نماز میں سینہ تانے ہوئے کھڑے ہونا، نماز کو اوّل وقت ادا کرنا۔

نوٹ:۔ دس (۱۰) ذی الحجہ کو "یوم النحر" بھی کہتے ہیں جو ثابت کرتا ہے کہ یہاں افضل معنی قربانی ہی کے ہیں۔

دوم معنی ہاتھ وضع کرنے کے جو قاموس میں ہیں وہ سیاق و سباق کے لحاظ سے درست نہیں ہیں اور آیت کا مطلب واضح نہیں کرتے نہ ہی نفس مضمون سے مطابقت رکھتے ہیں۔ لہٰذا جس نے بھی وہ معنی اختیار کئے ہیں وہ ہمارے لئے حجت قرار نہیں پا سکتے۔ کیونکہ زبان رسولؐ سے ثابت نہیں ہیں۔ جب کہ ہمارے بیان کردہ معنی لغت و قرآن سے بھی درست ہیں حالانکہ آیت میں "انحر" سے مراد قربانی ہی ہے۔ کیونکہ زیادہ شواہد ان ہی معنی کے ہیں۔

۳۔ قاموس سے جو ہاتھوں کے باندھنے کے معنی نقل ہیں وہ اصطلاحی اعتبار سے درج ہیں عام معنی نہیں ہیں۔ گنوار زبان میں "انحر" ہاتھ باندھنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہوگا وہ بھی ہاتھ جوڑنے کے مفہوم میں نہ کہ پیٹ کو پکڑنے کے معنی میں۔

۴۔ حاشیہ میں جو سورۂ کوثر کے مکی ہونے اور سورۂ بقر کے مدنی ہونے کا تذکرہ ہے وہ بھی معقول نہیں ہے کیونکہ سورۂ کوثر بہر صورت میں حکم قربانی سے قبل نازل ہوئی ہے۔ اگر بعد میں ہوتی تو اعتراض قابل غور تھا۔

۵۔ اگر "انحر" سے مطلب داہنے ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر رکھنا ہی ہے تو پھر کیوں نہ "دست بستہ" یعنی ہاتھ جوڑ کر ہی نماز پڑھ لی جایا کرے جو عاجزی کی اہم صورت معلوم ہوتی ہے۔ آخر پیٹ یا ناف کو پکڑنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوتی ہے کہ غیر مسلم کہتے ہیں کہ ان کے پیٹ میں درد ہے جو تھامے کھڑے ہیں۔ پس مولوی صاحب کی دلیل ناقابل تسلیم ہے کہ عقل و نقل سے ثابت نہیں۔

مخالف نقلی دلیل نمبر ۲

مولوی کرم دین صاحب نے دوسری نقلی دلیل سورۂ طٰہٰ اور سورہ قصص کی آیات سے قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور "واضمم یدک الی جناحک۔ الخ" اور "واضمم الیک جناحک من الرھب الخ" سے استدلال کیا ہے کہ "ضم" کے معنی ایک چیز کو دوسری سے ملانا ہے۔

جواب دلیل نمبر ۲

مولوی صاحب شیعہ دشمنی میں بوکھلائے ہوئے ہیں اور بغیر سوچے سمجھے ہانکے جا رہے ہیں۔ سورۂ طٰہٰ میں ذکر نماز ہے مگر سورۂ قصص کی آیت میں نماز کا تذکرہ ہی نہیں بلکہ وہاں اللہ نے حضرت موسیٰؑ کو دو (۲) معجزات عطا کرنے کا ذکر کیا ہے وہاں ضم سے مراد گریبان یعنی جیب سے ہاتھ ملانا ہے۔ دونوں ہاتھوں کے لئے دو (۲) الگ الگ کام ہیں۔ یہاں تو کسی صورت سے بھی ہاتھ کو باندھنے کے معنی کا اشتباہ پیدا نہیں ہو سکتا۔ اور اگر ایسا کریں گے تو بہت ہی الٹی صورت پیدا ہوگی کیوں کہ یہ کرامت عطا کرنے کے بعد اللہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے پاس جانے کا حکم دیا ہے۔ اگر یہاں ہاتھ باندھنا مراد لے لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ ہاتھ باندھ کر فرعون کے پاس جاؤ کہ میرے حضور۔ پس اگر مولوی صاحب کا خیال صحیح مان لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ کافروں کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو کر نماز میں ہاتھ باندھو۔ اس لئے دلیل بالکل بے ہودہ ہے۔

تیسری مخالف دلیل اور جواب

مولوی کرم الدین صاحب کی شیعہ مذہب سے عدم واقفیت کا یہ دلیل ہی کافی ثبوت ہے اس میں انہوں نے یہ تاثر دیا ہے کہ شیعہ عورتیں ہاتھ باندھ کر نماز پڑھتی ہیں جو کہ غلط محض ہے۔ نہ ہی شیعہ مرد ہاتھ باندھتے ہیں اور نہ ہی شیعہ عورتیں لہٰذا ایسی بے دلیل دلیل کا کیا جواب ہو؟

چوتھی مخالف دلیل مع جواب

چوتھی مخالف دلیل یہ ہے کہ مولوی صاحب نے لکھا ہے حضرت علیؑ نے حضرت ابوبکر کے پیچھے نماز پڑھی جب کہ ابوبکر ہاتھ باندھ کر نماز پڑھتے تھے۔

اس کا مفصل جواب ہم نے اپنی کتاب "ذکاء الافہام بجواب جلاء الافہام" المعروف "سو د۱۰۰ سنار کی ایک لوہار کی" میں لکھ دیا کہ حضرت ابوبکر نے کبھی ہاتھ باندھ کر نماز نہیں پڑھی۔ قارئین ملاحظہ فرمالیں۔

مولوی صاحب نے آگے سورۂ نور کی آیت پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے اسے جانوروں کی اتباع نہیں کرنا چاہیئے ہم کہتے ہیں کہ جانوروں کو فطری ہدایت ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ انسان نے اپنے سے پست مخلوق کو خدا مانا ہے لیکن ابتداء سے اب تک کسی جانور نے الوہیت سے انکار نہیں کیا ہے۔ لہٰذا معبود شناسی میں جانوروں کی فطری ہدایت کا انکار کرنا خلاف عقل و دانش ہے اور پھر آیت کے الفاظ ہیں کہ "سب کے سب اپنی نماز اور تسبیح خوب جانتے ہیں۔" یعنی خدا نے ان کو خود ہی طریقہ بتایا ہے لہٰذا یہ طریقہ خدا کا پسندیدہ ہے۔ تعین قبلہ اور طہارت وغیرہ کا جو اعتراض ہے وہ بھی غلط ہے کیونکہ جو طریقہ اللہ نے ان کو تعلیم فرمایا ہے وہ اسی پر عمل کرتے ہوں گے اور ظاہر ہے خدا نجس طریقہ پسند نہیں کرتا۔ اور پھر مولوی صاحب نے ایک جھوٹ اور لکھا ہے کہ امام مالک کی طرف شیعہ ہاتھ باندھنا منسوب کرتے ہیں حالانکہ یہ افتراء ہے۔ کیوں کہ مالکی مذہب تمام دنیا کے سامنے ہے۔ الغرض مولوی کرم الدین صاحب کے اعتراضات کے جوابات کے بعد اب ہاتھ باندھنے کی مذمت کے دلائل ہماری طرف سے پیش خدمت ہیں۔

اللہ بندھے ہاتھ پسند نہیں فرماتا

"ہاتھ بندھے ہوئے ہونا"[1] اس قدر مذموم عام ہے کہ زبان عرب میں مذمت

[1] اردو زبان میں بھی "ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنا" سستی اور بیکاری کے معنی میں محاورہ استعمال ہوتا ہے اسی طرح "ہاتھ پر ہاتھ مارنا" دھوکہ و فریب دینے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے

کے معنی کے ساتھ محاورہ بن چکا ہے کہ کنجوسی، بخل، بزدلی اور نیک کاموں سے اجتناب کرنے کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے۔ مثلاً قرآن مجید میں ہے کہ،

"وقالت الیهود ید الله مغلولة غلت ایدیهم ولعنوا بما قالوا بل یداه مبسوطتان ینفق کیف یشاء۔"

اور یہود نے کہا اللہ تعالیٰ کا ہاتھ بندھ گیا ہے۔ ان کے دونوں ہاتھ بندھیں اور ان کے اس کہنے پر لعنت ہوئی بلکہ اللہ کے دونوں ہاتھ کھلے ہیں اور جس طرح چاہتا ہے خرچ کرتا ہے۔ (سورۃ المائدہ آیت نمبر ۶۳)

وہ یہودی جن پر پروردگار نے اپنے کلام پاک میں لعنت فرمائی۔ ان کے لیئے یہ حالت بھی تجویز فرمائی ہے کہ ان کے دونوں ہاتھ بندھیں۔" اور ظاہر ہے کہ اللہ کا لعنت فرمانا اس کے غضب کا نتیجہ ہے۔ لہٰذا وہ "مغضوب علیہم" ہیں جن کے لیئے ہاتھ باندھنے کی سزا مقرر ہوئی اور "مغضوب علیہم" یقیناً صراط مستقیم سے دور ہیں۔ اور پروردگار عالم کے مجرم ہیں۔ لہٰذا مسلمانوں کو ان کے طریقے سے دور رہنا چاہیئے کیونکہ رب العزت کا یہی منشاء ہے کہ مسلمان مجرموں کی مانند نہ ہیں جیسا کہ سورۂ قلم میں ارشاد ہے۔

افنجعل المسلمین کالمجرمین مالکم کیف تحکمون (القلم پ۲۹)

کیا ہم بنادیں مسلمانوں کو مجرموں کی مانند، تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ کیسی بات کہتے ہو؟

اس آیت کے مطابق نماز میں ہاتھ باندھنا کیوں کر درست ہوگا۔ جب کہ نماز کی ہر کیفیت خود خدا کی مقرر کردہ ہے۔ تو ہاتھ باندھنا خدا کا پسندیدہ طریقہ کیوں کر قرار پاسکتا ہے اور مشاہدہ گواہ ہے کہ ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونا مجرموں کی مانند بن کر کھڑا ہونا ہے کہ جب ہتھکڑی وغیرہ بندھی ہوتی ہے تو ملزم و

نیز ہاتھ پر ہاتھ دھرے رہنا بے حسی و لاتعلقی کے لیئے بھی بولا جاتا ہے اور کاہلی و غفلت کے لیئے بھی۔ لہٰذا قدرت ایسی کیفیت نماز کے لیئے منتخب نہیں کر سکتی ہے۔

مجرم ایسے ہی ہاتھ بندھے کھڑے ہوتے ہیں۔

اس طرح سورۂ بنی اسرائیل میں ہے کہ "لا تجعل یدک" کہ اپنے ہاتھ نہ باندھو یعنی معلوم ہوا کہ خدا بندھے ہاتھ پسند نہیں کرتا بلکہ ایسا سننا بھی اسے گوارہ نہیں کہ جو اس فعل کو خدا سے غلط بھی منسوب کرے قابلِ لعنت ہے اور اسے بددعا یہ ہے کہ "اس کے دونوں ہاتھ بندھیں"۔ اور یہ صاف ظاہر ہے اللہ نے خود کہا ہے کہ میرے دونوں ہاتھ کھلے ہیں۔ اور خدا کے ہاتھوں سے مراد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ ہیں۔

مذہب شیعہ میں مرد اور عورت الگ الگ طریقے سے نماز پڑھتے ہیں۔ مرد ہاتھ کھولتے ہیں اور رانوں پر لٹکاتے ہیں مگر عورتیں ہاتھ کھول کر اپنے الگ الگ سینہ پر رکھتی ہیں جبکہ غیر شیعہ حضرات و خواتین ہاتھ باندھ کر ہی نماز ادا کرتے ہیں۔ چنانچہ کلام خداوندی ہے کہ:۔

"المنٰفقون والمنٰفقٰت بعضھم من بعض یامرون بالمنکر وینھون عن المعروف ویقبضون ایدیھم نسوا اللہ فنسیھم ان المنٰفقین ھم الفٰسقون"

"منافق مرد اور منافق عورتیں سب ایک طرح کے ہیں کہ بری باتوں کی تعلیم دیتے ہیں اور اچھی باتوں سے روکتے ہیں۔ اور اپنے ہاتھوں کو بند رکھتے ہیں۔ انہوں نے خدا کا خیال نہ کیا بلا شبہ یہ منافق بڑے ہی سرکش ہیں۔ (سورۂ توبہ پ ۱۰ ع ۱۴)

آیت منقولہ سے معلوم ہوا کہ ہاتھوں کا بند ہونا منافقین کی خاص نشانی ہے اور ان کی عورتوں اور مردوں کی حالت و کیفیت ایک سی ہے کہ ہاتھ بند ہوتے ہیں۔

نوٹ:۔ بعض لوگ "ید" کا ترجمہ مٹھی کرتے ہیں تاکہ شیعہ کی مخالفت قائم رہے خواہ قرآن مجید کے معنی و مفہوم میں تحریف ہو جائے مگر ان کے لئے عرض ہے کہ آیتِ وضو میں اللہ تعالیٰ نے خود "ید" کے معنی بیان کر دیئے ہیں۔ لہٰذا آیت وضو ملاحظہ کر لی جائے کہ "ید" کہنیوں تک شمار ہے پس قرآن سے ثابت ہوا کہ بندھے ہاتھ خدا کو پسند نہیں خواہ نام نہاد عاجزی ہی کیوں نہ ہو۔

ہاتھ باندھنے کی روایات کی وضعیت

قرآن مجید سے تو پوری طرح ثابت ہو گیا کہ نماز میں اصل حکم ہاتھ کھول کر پڑھنے کا ہے۔ ہاتھ باندھنے کا حکم قرآن میں کہیں نہیں ہے احادیث سے بھی ہاتھ باندھنا ثابت نہیں ہے۔ اہلسنت کی طرف سے تو روائتیں ہاتھ باندھنے کے جواز میں پیش کی جاتی ہیں۔ اب ہم ان سب پر جرح کر کے کتب اہلسنت ہی سے ان روایات کو بناوٹی اور ناقابلِ اعتبار ثابت کرتے ہیں۔

۱۔ ترمذی مطبوعہ اصح المطابع باب ماجاء فی الیمین ص ۳۴ سطر ۶۔

قتیبہ نے ابوالاحوص سے اس نے سماک بن حرب سے اس نے قبیصہ بن ھلب سے اس نے اپنے باپ سے روایات کی ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ حضرت رسول اللہ صلعم ہم لوگوں کی امامت کرتے تھے پس بایاں ہاتھ دہنے سے پکڑ لیتے تھے۔

جرح نمبر ۱ اس روایت کے راوی سماک بن حرب کو سفیان ثوری اور بزوری نے غیر معتبر کہا ہے۔ جریر عینی ان سے حدیث نہیں لیتے تھے۔ امام اہل سنت احمد بن حنبل کہتے ہیں کہ مضطرب الحدیث تھے۔ امام نسائی غیر معتبر مانتے تھے۔ (میزان الاعتدال بیان سماک بن حرب)

۲۔ محمد بن بکار بن ریان نے ہشیم بن بشیر سے اس نے حجاج بن وہب سے اس نے ابوعثمان سے روایت کیا ہے کہ اس نے کہا ابن مسعود بایاں ہاتھ داہنے پر رکھ کر نماز پڑھ رہے تھے تو حضرت صلعم نے ان کا داہنا ہاتھ بائیں ہاتھ پر رکھ دیا۔ (سنن ابوداؤد)

جرح نمبر ۲ اس روایت کا راوی محمد بن بکار مجہول ہے اور ہشیم بہت تدلیس کیا کرتے تھے۔ سفیان ثوری نے کہا کہ ان سے حدیثیں نہ لی جائیں یہ لوگوں کی طرف غلط نسبت دے کر حدیثیں بیان کیا کرتے تھے۔

اور حجاج کو اہلِ سنت کے امام احمد بن حنبل اور ابن مدینی اور امام نسائی اور دارقطنی نے غیر معتبر کہا ہے۔ (میزان الاعتدال)

۳۔ ابو ثوبہ نے ہشیم بن حمید سے اس نے محمد بن حمید سے اس نے ثور سے اس نے سلیمان بن موسیٰ سے اس نے طاؤس سے روایت کی ہے کہ حضرت سرورِ دو عالمؐ داہنا ہاتھ بائیں ہاتھ پر رکھ کر سینے پر رکھتے تھے۔ (سنن ابو داؤد)

۴۔ حضرت سرورِ کائناتؐ نے ارشاد فرمایا کہ داہنے ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر ناف کے نیچے رکھنا سنت ہے۔ (شرح ہدایہ باب صفت الصلوٰۃ جلد ۱ صفحہ ۹۶)

جرح ۳، ۴

اب دیکھئے پہلی حدیث (۳) میں ہے کہ رسولؐ سینے پر ہاتھ باندھتے تھے اور دوسری حدیث (۴) میں ناف کے نیچے ہاتھ باندھنا سنت لکھا گیا ہے۔ لہٰذا دونوں روایتوں کا تضاد ان کے موضوع ہونے کی واضح دلیل ہے۔ تاہم کتب اہل سنت سے مزید جرح پیش کی جاتی ہے۔

ا۔ حدیث ۳ ملاحظہ ہو۔ میزان الاعتدال علامہ ذہبی حال محمد بن حمید اس روایت کے راوی ہشیم کو خود ابو داؤد نے قدری مذہب کہا ہے۔ اور ابو مسہر غسانی نے قدری مذہب اور غیر معتبر کہا ہے اور دوسرے راوی محمد بن حمید کو امام اہلسنت ابن حجر عسقلانی نے اپنی کتاب تقریب میں غیر معتبر لکھا ہے۔ امام اہلسنت ذہبی لکھتے ہیں کہ یہ غیر معتبر اور نہایت جھوٹے تھے۔ اور حدیثوں میں تصرف کیا کرتے تھے۔ حدیثیں چرایا بھی کرتے تھے ان سے بڑھ کر کسی کو نہ پایا۔

ب۔ حدیث ۴ میں پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ حدیث صاحب ہدایہ نے بغیر سند کے لکھی ہے اور مولوی عبدالحی فرنگی محلی حاشیہ میں امام اہلسنت نووی کا قول لکھتے ہیں کہ اس حدیث کی بے اعتباری پر تمام علماء کا اتفاق ہے۔

۵۔ عبداللہ بن مسلمہ نے امام مالک سے انہوں نے ابو حازم سے انہوں نے

سہل بن سعد سے روایت کی ہے کہ لوگوں کو حکم دیا جاتا تھا کہ نمازی نماز میں داہنا ہاتھ بائیں ہاتھ پر رکھیں۔ ابو حازم کہتے ہیں کہ غالباً اس میں رسولؐ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ (صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ باب وضع الیمنیٰ علی الیسریٰ جلد ۱ صفحہ ۹)

جرح ۵

پہلی تو یہ بات ہے کہ امام مالک خود ہاتھ کھول کر نماز پڑھا کرتے تھے۔ اس لئے یہ ان کی روایت ہی نہیں ہو سکتی۔ دوسرے یہ کہ یہ ارشاد رسول کریمؐ کا نہیں ہے بلکہ سہل بن سعد کا قول ہے کسی دوسرے کا فتویٰ ہے۔ ابو حازم کی حدس و تخمین کہ سہل نے غالباً رسول کی طرف نسبت دی ہے۔ یہ حدس حجت نہیں ہو سکتا کیونکہ حدیث کو حتمی ہونا چاہیئے نہ کہ حدسی یعنی ویسے ہی کہہ دیا کہ شاید رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہی فرمایا ہے اور اس حدیث میں رسول کی طرف اشارہ ہونا بالصراحت معلوم نہیں ہے۔ ابو حازم نے بھی رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف نسبت نہیں دی۔

۶۔ محمد بن قدامہ نے ابو بدر سے اس نے ابو طالوت سے اس نے ابن جریر ضبی سے اس نے اپنے باپ جریر سے روایت کی ہے کہ میں نے علیؑ کو دیکھا وہ اپنے بائیں ہاتھ کو داہنے سے پکڑتے تھے۔ (سنن ابو داؤد باب وضع الیمین صفحہ ۷۶)

جرح ۶

اس کے راوی ابو بدر شجاع بن ولید کو ابو حاتم نے غیر معتبر کہا ہے اس کی حدیثیں ضعیف ہوتی تھیں اور کہا ہے کہ یہ اچھے آدمی نہیں تھے۔ ان پر اعتبار نہ کرنا چاہیئے۔ (میزان الاعتدال بیان شجاع بن ولید)

۷۔ نصر بن علی نے ابو احمد سے اس نے علاء بن صالح سے اس نے زرعہ بن عبدالرحمٰن سے روایت کی ہے کہ اس نے کہا کہ ہم نے عبداللہ بن زبیر کو کہتے سُنا کہ قدموں کو برابر رکھنا اور ہاتھ کو ہاتھ پر رکھنا سنت ہے۔

(سنن ابو داؤد وضع الیمین صفحہ ۷۹)

جرح ۷ اس کا راوی نصر بن علی متہم ہے۔ ابو احمد مجہول ہے۔ ناپسندیدہ حدیثیں بیان کرتا تھا۔ اور علا بن صالح ناپسندیدہ حدیثیں بیان کرتا تھا۔ اور زرعہ سے لوگ حدیثیں نہیں لیتے تھے اور اس کی حدیثیں باطل ہوتی تھیں۔ (میزان الاعتدال علامہ ذہبی)

اس کے علاوہ یہ حدیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہیں ہے۔ بلکہ قول عبداللہ بن زبیر ہے۔ اس لئے حجت نہیں ہے۔ نیز یہ کہ ابن زبیر تو خود ہاتھ کھول کر نماز پڑھتے تھے۔

۸۔ منذر نے عبدالواحد بن زیاد سے اس نے عبدالرحمن بن اسحاق سے اس نے سیار ابوالحکم سے اس نے ابووائل سے روایت کی ہے کہ ابوہریرہ نے کہا کہ ہاتھ کو ہاتھ کے نیچے رکھنا چاہیئے۔ (سنن ابوداؤد)

جرح ۸ یہ حدیث رسولؐ کی نہیں بلکہ صرف ابوہریرہ کا قول ہے جو کہ حجت نہیں ہو سکتا ہے۔

۹۔ محمد بن محبوب نے حفص بن غیاث سے اس نے عبدالرحمن بن اسحاق سے اس نے زیاد بن زبیر سے اس نے ابو جحیفہ سے روایت کی ہے کہ علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا ہاتھ پر ہاتھ رکھنا سنت ہے۔ (سنن ابوداؤد)

جرح ۹ میزان الاعتدال اور حاشیہ سنن ابن ماجہ صہ ۵۹ میں ہے کہ اس روایت کا راوی محمد بن محبوب قدری مذہب تھا اور حفص حدیثوں میں غلطی بہت کرتے تھے اور عبدالرحمن بن اسحق کو سب نے غیر معتبر کہا ہے۔ امام احمد بن حنبل کہتے ہیں کہ یہ کچھ نہ تھے۔ ان کی حدیثیں بے ہودہ ہوتی تھیں۔ لوگ ان سے حدیثیں نہیں لیتے تھے۔ ان کے غیر معتبر ہونے پر سب نے اتفاق کیا ہے۔

پس ثابت ہوا کہ مذہب اہل سنت والجماعت کے پاس ہاتھ باندھنے کے ثبوت میں ایک بھی حدیث صحیح مرفوع اور معتبر نہیں ہے۔

ہاتھ کھولنے کے دلائل

شاہ محمد اسمٰعیل شہیدؒ کا اعتراف

تنویر العینین مطبوعہ دین محمدی پریس لاہور صہ ۲۱ میں مشہور دیوبندی علامہ جناب شاہ اسمٰعیل المعروف شہید لکھتے ہیں کہ اصل حکم نماز میں ہاتھ کھولنے کا ہے لیکن روافض سے مشابہ ہونے کے باعث اسے ترک کر دیا گیا۔

"حکم تو ہاتھ کھولنے ہی کا ہے۔ ساتھ ہی یہ کہ یہی حکم قرن اول (یعنی زمانہ رسولؐ) میں مشہور تھا اور اسی (ہاتھ کھولنے) پر قرن آخر کے علماء کی اکثریت نے اتفاق رکھا۔ اور یہ بھی کہتے ہیں کہ ان شہروں میں یہ فعل (یعنی ہاتھ کھولنا) روافض سے مشابہ ہونے کی وجہ سے مذہب حنفیہ کے پیروکاروں نے چھوڑ دیا پس اس کے فعل پر باقی نہ رہے سوائے شیعہ کے۔"[1]

علامہ وحید الزماں کا اقرار

اسی طرح مشہور علامہ اہلحدیث مولوی وحید الزماں خان صاحب اپنی کتاب ہدیۃ المہدی جلد ۱ صہ ۱۲۶ پر لکھتے ہیں کہ۔

فمن جعل الارسال من شعائر الروافض فقد اخطأ... الخ

یعنی جو یہ کہتا ہے کہ ہاتھ کھول کر نماز پڑھنا شیعوں کا شعار ہے تو وہ غلطی پر ہے اور اس رائے میں خطا کار شیعوں کا ہی نہیں تمام اہل اسلام کا یہی عمل رہا ہے۔ خصوصاً زمانہ نبیؐ میں کل اصحاب اسی پر عامل تھے اور ہاتھ باندھنے کا کہیں نام بھی نہ تھا۔

---

[1] شاید شاہ صاحب مالکیوں کو اہلسنت تسلیم نہیں کرتے تھے ورنہ مالکی آج بھی ہاتھ کھولتے ہیں۔

عبداللہ بن زبیر کی نماز

تیسیر الوصول جلد ۲ صفحہ ۲۹۹ باب خامس بیان کیفیت نماز ابن ابی شیبہ عفان سے وہ یزید ابن ابراہیم سے نقل کرتے ہیں۔ کہ ہم نے عمرو بن دینار کو کہتے سنا ہے کہ عبداللہ بن زبیر ہاتھ کھول کر نماز پڑھا کرتے تھے۔ اور علامہ زمان بحر العلوم اور صحابی مشہور یعنی عبداللہ بن عباس چچا زاد بھائی حضور ؐ کے بیان فرماتے ہیں کہ اگر تم حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی نماز دیکھنا چاہتے ہو تو عبداللہ بن زبیر کی نماز دیکھ لو۔

نماز رسول ؐ و صحابہ ؓ اور امام مالک ؒ کا قول

قال العینی فی شرح کنز الدقائق قال مالک العزیمۃ فی الارسال والرخصۃ فی الوضع والاختلاف النبی کان یفعل کذالک وکذا اصحابہ حتی تنزل الدم من رؤس انامل ھم ..... الخ

شرح کنز الدقائق (صفحہ ۲۵) میں علامہ عینی حنفی تحریر کرتے ہیں کہ امام مالک کہتے تھے کہ حکم تو ہاتھ کھولنے کا ہے اور ہاتھ باندھنے کی اجازت ہے اس لئے کہ نبی ؐ اسی طرح ہاتھ کھول کر ہی نماز پڑھا کرتے تھے اور اسی طرح آپ ؐ کے اصحاب کرام یہاں تک کہ ہاتھ جھکے لٹکے انگلیوں کی پوروں میں خون اتر آتا تھا۔ (روضۃ الندیہ صفحہ ۶۵)

"ہاتھ باندھنا محتاج دلیل اور امر جدید ہے"

مشہور و معروف دیوبندی بزرگ علامہ شاہ محمد اسمٰعیل المعروف شہید دہلوی اپنی کتاب "تنویر العینین" کے صفحہ ۳۰ پر یوں لکھتے ہیں :-

"اما ماروی عن الارسال عن بعض التابعین من النخعی الحسن و ابراھیم وابن المسیب وابن سیرین کما اخرجہ ابن شیبۃ فان بلغ عندھم حدیث الوضع فمحمول علی انھم یحسبوہ بسنۃ من سنن الھدیٰ بل حسبوہ عادۃ من العادات فمالوا الی الارسال لاصالتہ مع جواز الوضع وان لم یبلغ عندھم امر الوضع فعلموا بالارسال بناءً علی الاصل اذ الوضع امر جدید یحتاج الی الدلیل"

ترجمہ :- البتہ ارسال (یعنی نماز میں ہاتھوں کو کھلے چھوڑنا) جو حسن بصری و ابراہیم وابن مسیب وابن سیرین جیسے بعض تابعین سے روایات کیا گیا ہے جیسا کہ اس (ہاتھ کھول کر نماز پڑھنے) کو ابن شیبہ نے نقل کیا ہے تو اگر ان (تابعین) کو ہاتھ باندھنے کی حدیث پہنچی تھی تو اس پر محمول ہے کہ انہوں نے اس (ہاتھ باندھنے) کو ہدایت کی سنتوں میں سے سنت ہرگز نہیں سمجھا بلکہ ان (تابعین) نے اس (ہاتھ باندھنے) کو عادتوں میں ایک عادت شمار کیا۔ (اگر رسول ؐ کی عادت ہوتی تو ضرور سنت سمجھتے) پس وہ ہاتھ کھولنے ہی کی جانب مائل رہے اس کے اصل ہونے کی وجہ سے مع جواز وضع کے[1]۔ اور اگر ہاتھ باندھنے کی حدیث ان (تابعین) کے پاس پہنچی ہی نہیں تو اس پر محمول ہے کہ ہاتھ باندھنے کا حکم ان کے نزدیک ہرگز ثابت نہیں ہوا۔ پس انھوں نے ہاتھ کھولنے کی تعلیم دی اصل ہونے کی بنا پر جب کہ وضع (یعنی ہاتھ باندھنا) امر جدید ہے[2] دلیل کا محتاج ہے"

ح ۱ جواز کا ثبوت موجود نہیں ہے۔

ح ۲ امر جدید کو شش بدعت بھی کہتے ہیں۔

ہاتھ باندھنے کے متعلق امام مالک کا حکم "موطا" میں

مولوی کرم الدین نے دروغ گوئی سے کام لیتے ہوئے اپنی کتاب آفتاب ہدایت کے صفحہ ۳۴۲ پر لکھا ہے کہ شیعوں نے ہاتھ باندھنا امام مالک کی طرف منسوب کیا ہے جبکہ وہ مالک بن عطیہ شیعی ہیں جنہوں نے اس مسئلہ پر زور دیا اور امام مالک نے موطا میں باندھنے کا اقرار کیا ہے۔ لہٰذا ہم مولوی موصوف کا یہ جھوٹ موطا امام مالک ہی سے ظاہر کرتے ہیں کیونکہ خوش قسمتی سے انہوں نے "موطا" کو امام مالک کی کتاب تسلیم کیا ہے ورنہ شاید وہ کتاب ہی سے انکار کر دیتے۔ ہو سکتا ہے قاضی مظہر حسین صاحب یہ جرأت کر ڈالیں۔

چنانچہ موطا امام مالک (عربی) مطبوعہ نور محمد اصح المطابع کراچی صفحہ ۱۴۲ کے حاشیہ کشف المغطا میں مولانا اشفاق الرحمٰن کاندھلوی لکھتے ہیں: "قال مالک فی وضع الیمنیٰ علی الیسریٰ قال لا اعرف ذالک فی الفریضة وکان یکرهه ولکن فی النوافل اذا طال القیام فلا بأس بذالک لیعین به نفسه" یعنی دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ پر رکھنے (ہاتھ باندھنے) کے بارے میں امام مالک نے فرمایا کہ فریضہ (یعنی نماز فرض) میں میں اس (ہاتھ باندھنے) سے واقف تک نہیں ہوں (یعنی نماز فرض میں امام مالک ہاتھ باندھنے کے قائل نہیں تھے۔) اور اس کو مکروہ جانتے تھے۔ لیکن ہاں نوافل میں جب قیام طول پکڑ جائے تو حرج نہیں کہ اپنی جان کی مدد کے لئے ہاتھ باندھ لئے جائیں (غالباً ایسی ضرورت تراویح میں محسوس ہوئی ہو)

ہاتھ باندھنے کے متعلق موطا کے اسی صفحہ پر حاشیہ میں لکھا ہے:

"اجازها مالک فی النفل ولم یجزها فی الفرض" یعنی امام مالک نے ہاتھ باندھنے کی اجازت نفل میں دی ہے اور فرض میں اس کی اجازت

نہیں ہے۔

معلوم ہوا کہ امام مالکؒ نے محض حفاظت جان کے لئے نوافل میں ایسی اجازت دی ہے اور فرض میں ہاتھ باندھنے سے روکا ہے کیونکہ ان کو معلوم تھا کہ اللہ بندھے ہاتھوں کو پسند نہیں کرتا ہے اور بیمار کو صرف رعایتاً انہوں نے ایسا کرنے کی اجازت دی ہے جبکہ اس کا کوئی نقلی ثبوت موجود نہیں ہے۔

ہاتھ باندھنے کا آغاز کیسے ہوا؟

اس بات کا جواب کتاب "الاوائل" میں علامہ عسکری نے تفصیل سے لکھا ہے کہ جب مجوسی قیدی حضرت عمر کے سامنے لائے گئے تو وہ قیدی خود ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ جب حضرت عمر نے وجہ پوچھی تو ان قیدیوں نے بتایا کہ "بادشاہ کی تعظیم میں ہم ایسا ہی کرتے ہیں" حضرت عمر یہ سن کر بہت خوش ہوئے اور کہا ہمیں بھی اپنے خدا کے سامنے یونہی ہاتھ باندھ کر نماز پڑھنی چاہیئے۔ اور حکم جاری کر دیا کہ نماز ہاتھ باندھ کر پڑھی جائے۔

لیکن اہلسنت علماء یہ الزام حضرت عمر پر پسند نہیں کرتے لہٰذا ان کی رائے یہ ہے کہ چونکہ روافض شروع سے ہاتھ کھول کر نماز پڑھتے ہیں اس لئے ان کی مخالفت کی غرض سے ہم لوگ ہاتھ باندھ کر نماز پڑھتے ہیں۔ چنانچہ علامہ برجندی نے اپنی شرح وقایہ میں اس بات کی وضاحت کی ہے کہ ہم روافض (شیعوں) کی مخالفت کرنے کے لئے نماز میں ہاتھ باندھتے ہیں۔ ملاحظہ کریں۔

(شرح وقایہ جلد ۱ صفحہ ۱۰۲، سطر ۱۲ مطبوعہ نولکشور)

ماشاءاللہ! نماز میں ضد؟

ہائے ری شیعہ دشمنی تیرے رنگ بھی نرالے ہیں!

"علی ولی اللہ"

اس موضوع پر ہم نے کتاب "علی ولی اللہ" مرتب کی ہے اور ثابت کیا ہے اقرارِ ولایتِ علیؑ اتباعِ خدا و رسول ہے اور کلمہ کے ساتھ علیؑ ولی اللہ کتب اہل سنت سے مکمل طور پر ثابت ہے۔ تاہم مختصراً عرض یہ ہے کہ اللہ کو "اللہ" کہنا، نبی آخر الزماںؐ کو "رسول" کہنا حق ہے، کہ زید کو ڈاکٹر اور بکر کو ڈپٹی کہنا کسی بھی جہت سے قابلِ اعتراض نہیں ہے۔ کیونکہ اگر خدا کو اللہ کہتے ہیں تو فی الحقیقت وہ ہے ہی اللہ اور اگر حضورؐ کو رسول کہا جائے تو بھی درحقیقت اللہ کے رسول ہیں۔ زید چونکہ علمِ طب کا ماہر ہے جسے ڈاکٹر کہتے ہیں لہٰذا اُسے ڈاکٹر کہنا بُری بات نہیں اور چونکہ بکر ڈپٹی کے عہدے پر فائز ہے اس لئے اسے ڈپٹی صاحب کہنے پر کیا اعتراض ہوگا۔ البتہ فرعون کو اللہ کہا جائے تو کفر و شرک ہوگا کہ وہ خدا ہے ہی نہیں۔ اسی طرح اگر کسی غلام احمد کو نبی کہنا شروع کر دیا جائے تو کفر ہوگا کہ وہ کاذب ہے۔ اور اگر کسی سبزی فروش کو ڈاکٹر کہا جائے تو جہالت ہوگی۔ اسی طرح اگر چپڑاسی کو ڈپٹی صاحب سے پکارا جائے تو وہ مذاق ہی سمجھا جائے گا۔ معلوم ہوا کسی حاملِ منصب کو اس کے منصب سے پکارنا مذموم نہیں بلکہ جائز ہے۔ اس کے برعکس کسی غیر اہل کو ایسا پکارنا جہالت و دیوانگی ہوگا۔ حضرت علی علیہ السلام کو اگر ہم "اللہ کا ولی" کہتے ہیں تو اس لئے کہ وہ اللہ کے ولی ہیں لہٰذا ولی کو ولی کہنا کیوں کر معیوب ہو سکتا ہے۔ اس سے پہلے کہ ولایت حضرت علیؑ کے بارے میں کچھ گفتگو کی جائے ہم معترضین سے یہ پوچھتے ہیں کہ وہ بتائیں کہ درود شریف میں اصحاب و ازواج کو کیوں ملایا جاتا ہے۔ جب کہ نماز میں صرف محمدؐ و آلِ محمدؑ ہی پر پڑھا جاتا ہے؟ نیز جمعہ وغیرہ کے خطبوں میں آپ لوگ حضرت ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ و علیؑ

کے نام کیوں لیتے ہیں جب کہ آنحضرتؐ کے خطبہ میں یہ نام شامل نہ تھے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ رسول اللہؐ کی حیاتِ طیبہ میں یہ نام خطبوں میں نہیں پکارے جاتے تھے ورنہ ثابت کر دیجئے۔

شاید آپ کہیں کہ صحیح مسلم کی روایت کے مطابق امرِ جدید اگر حسنہ ہو تو قابلِ ثواب ہوتا ہے اور نفلی عبادت جتنی بھی کر لی جائے ذریعہ ثواب ہے کہ نوافل جتنے چاہیں پڑھ سکتے ہیں، باعثِ ثواب ہوگا۔ زکوٰۃ مقررہ مقدار سے زیادہ بھی ادا کی جا سکتی ہے۔ حج حالانکہ زندگی میں ایک ہی مرتبہ فرض ہے لیکن جتنے چاہیں کر لئے جائیں۔ لہٰذا اس نظریہ سے معلوم ہوا کہ نیک عمل یعنی عبادت کی اس مقدار سے جو مقرر کی گئی ہو زیادہ کرنا کوئی گناہ نہیں بلکہ ثواب ہے بشرطیکہ اس اضافہ کرنے سے قرآن و سنتِ نبوی کی مخالفت نہ ہو۔ پس اسی نظریہ کے ماتحت ہم کہتے ہیں "علی ولی اللہ" کہنا عبادت ہے۔ اور یہ کہنے سے نہ ہی توحیدِ خدا وندی کے عقیدے کو ضعف پہنچتا ہے اور نہ ہی رسالت کے ایمان میں کمی آجاتی ہے۔ بلکہ اس اقرار سے کلمہ طیبہ بن جاتا ہے اور بلند ہو جاتا ہے۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ اس نظریہ کی اساس پر اقرارِ "علی ولی اللہ" کم سے کم امرِ جدید یعنی بدعت تو ثابت ہوتا ہے۔ لیکن بدعتِ حسنہ جب کہ ولایت و امامت کا عقیدہ شیعوں کے نزدیک اصولی ہے لہٰذا ضروری ہے کہ اس کی اساس نصِ صریحی پر ہو۔ چنانچہ اس کا جواب یہ ہے کہ متذکرہ بالا دلیل ہماری نہیں ہے بلکہ فریقِ مخالف ہی کی دلیل پر ہم نے استدلال کیا ہے۔ جب کہ ہمارا ایمان بے شک یہ ہے کہ ولایت کا عقیدہ اصولی ہے اور اس کا منکر مومن نہیں ہے۔ یہ پوری بحث ہم نے کتاب "علی ولی اللہ" میں تفصیل سے کر کے ناصبیوں کے دانت کھٹے کر دیئے ہیں۔ اور اس کتاب پر ۵ ہزار روپیہ کا انعام بھی پیش کرنے کا اعلان کیا ہے۔ مگر یہاں عرض صرف اتنی ہے کہ نہ صرف "علی ولی اللہ" سنتِ رسولؐ سے

ثابت ہے بلکہ کلامِ خدا سے بھی مکمل طور پر ثابت ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے

"انما ولیکم اللہ و رسولہ والذین امنوا الذین یقیمون الصلوٰۃ ویؤتون الزکوٰۃ وھم راکعون۔" (سورۂ مائدہ)

ترجمہ:- بس اللہ تمہارا ولی ہے۔ اور رسولؐ ولی ہے اور وہ مومنین جو قائم کرتے ہیں نماز کو اور حالتِ رکوع میں زکوٰۃ دیتے ہیں۔

مشہور اہلسنت تفسیر قادری اور دیگر تفاسیر میں ہے کہ یہ آیت حضرت علیؑ کی شانِ مبارک میں نازل ہوئی جب کہ انہوں نے حالتِ رکوع میں سائل کو انگشتری عطا فرمائی۔ پس اس آیت کے تحت حضرت علیؑ کو ولی تسلیم کرنا ضروری ہوا اور اس کا منکر مومن نہ رہا کہ آیت قرآن سے انکار کیا۔ اس کے علاوہ مشکوٰۃ شریف میں حضرت ام المومنین بی بی عائشہ سے حدیث بیان ہوئی ہے کہ علیؑ کا ذکر عبادت ہے۔ یہ حدیث صواعق محرقہ کے علاوہ اور کئی معتبر کتابوں میں درج ہے۔ لہٰذا ذکرِ علیؑ کلمہ کے ساتھ بھی عبادت ہے۔ کیونکہ کلمہ کے ساتھ بسم اللہ شریف پڑھنا مانع کلمہ نہیں ہے۔ حالانکہ حضرت علیؑ نے فرمایا کہ میں "ب" کا نیچے والا نقطہ ہوں۔ جب بسم اللہ کلمے کے ساتھ پڑھی جا سکتی ہے تو "علی ولی اللہ" بھی کہا جا سکتا ہے۔ اسی طرح ضروری ہے کہ جب کبھی حضورؐ کا نام آئے تو قاری اور سامع پر واجب ہے کہ آپؐ پر درود پڑھے لہٰذا جب کلمے میں آنحضرتؐ کا اسم مبارک زبان سے ادا ہوگا تو درود پڑھنا ضروری ہوگا اور ارشادِ رسولؐ ہے کہ مجھ پر درود پورا پڑھو۔ ادھورا درود لوٹا دیا جاتا ہے۔ پس کلمہ میں اگر حضورؐ کے نامِ نامی کے بعد "صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم" کا اضافہ کر دیا جائے تو یہ اضافہ مانع کلمہ نہ ہوگا۔ افسوس ہے کہ درود کا وِرد جائز سمجھا جائے اور صاحبِ درود کے ذکر کو معاذ اللہ بدعت کہا جائے جب کہ ذکر "علی ولی اللہ" کلمہ کے ساتھ عبادت ہے اور خود

رسول کریمؐ نے "علی ولی اللہ" پڑھا ہے۔ اور اقرار ولایت تعمیل حکم پیغمبرؐ ہے۔ فرائد السمطین مولفہ حموینی میں ہے کہ زمانۂ رسولؐ میں اقرار وصی رسولؐ کیا جاتا تھا۔ جب کوئی مسلمان ہوتا تھا تو وہ توحید و رسالت کے علاوہ وصی رسولؐ کی شہادت بھی دیتا تھا۔

قرآن مجید کے مطابق حضورؐ مثیل موسیٰؑ ہیں اور جناب امیرؑ مثیل ہارونؑ ہیں۔ زمانۂ موسیٰؑ میں جب کوئی مسلمان ہوتا تھا تو وہ موسیٰؑ و ہارونؑ دونوں پر ایمان لاتا تھا جیسا کہ ارشاد ہے: قالوا امنا برب العلمین ۝ رب موسیٰ و ھارون۔ لہٰذا ضروری ہے مومن حضرت محمد مصطفیٰ اور حضرت علی مرتضیٰ دونوں پر ایمان لائے۔ دیکھیے میرا رسالہ "اصول دین" باب امامت۔

ہم حضرت علیؑ کی ولایت کا اقرار جزو کلمہ ہی سے نہیں بلکہ جزو ایمان سے کرتے ہیں۔ سفرِ آخرت کے لئے توحید و رسالت کے ساتھ سرمایہ ولایت بھی ساتھ لیتے ہیں تاکہ پلِ صراط پر کام آئے کہ حضرت ابوبکر نے کہا ہے کہ کوئی شخص اس وقت تک پلِ صراط پار نہ کرے گا جب تک علیؑ کا پروانہ راہداری نہ ہوگا۔

جناب رسالت مآبؐ نے فرمایا کہ "علیؑ میرے بعد ہر مومن کا ولی ہے۔"

ملاحظہ ہوں کتب اہلسنت:-

(۱) خصائص امام نسائی (۲) تہذیب الآثار ابن جریر طبری
(۳) ریاض النضرہ (۴) اصابہ فی تمیز الصحابہ
(۵) اسد الغابہ فی معرفۃ الاصحابہ (۶) مناقب ابو مغازلی
(۷) کنز العمال ملا علی متقی (۸) قول الجلی فی الفضائل العلی علامہ جلال الدین سیوطی
(۹) تہذیب الکمال
(۱۰) مسند ابو داؤد طیالسی (۱۱) استیعاب فی معرفۃ الاصحاب علامہ ابن عبد البر
(۱۲) فردوس الاخبار دیلمی (۱۳) ترمذی (۱۴) طبرانی

(۱۵) میزان الاعتدال (۱۶) جمع الجوامع سیوطی (۱۷) الاکتفا فی الفضائل الاربعہ الخلفا صابی (۱۸) تاریخ بغداد خطیب بغدادی (۱۹) صحیح مسلم (۲۰) ینابیع المودۃ ۔ وغیرہ وغیرہ تمام کتب اہل سنت میں ولایت علی علیہ السلام منقول ہے۔ اور اس حدیث میں حضورؐ کے ارشاد میں لفظ "بعدی" قابلِ غور ہے اور ثابت کرتا ہے کہ حکم اقرارِ ولایت بعد از زمانۂ رسولؐ ضروری ہے اس لئے "علی ولی اللہ" کا اقرار کر کے اتباعِ رسولؐ کرنا ہر مسلمان پر لازم ہے۔ اسی لئے حضور پیغمبرِ اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادِ ہدایت "ولی کل مومن بعدی" کے پیشِ نظر ہم اہلِ ایمان تعمیل حکم رسولؐ کرتے ہیں۔

سرکار رسالت مآبؐ نے شبِ معراج دروازۂ جنت پر جو کلمہ سونے کے حروف میں لکھا ہوا دیکھا اس سے بھی ولایت علیؑ ثابت ہے۔ چنانچہ مولوی عبیداللہ بسمل اپنی کتاب ارجح المطالب میں زیرِ عنوان "ولی اللہ" دیلمی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ

جناب سرورِ کائناتؐ نے فرمایا میں نے شبِ معراج دروازۂ جنت پر سونے سے لکھا دیکھا "لا الہ الا اللہ محمد حبیب اللہ علی ولی اللہ . . . الخ یعنی اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں محمد حبیب خدا ہیں علی اللہ کے ولی ہیں۔ فاطمہ کنیزِ خدا ہیں۔ حسن و حسین صفوۃ اللہ ہیں۔ ان کے دشمن پر اللہ کی لعنت!"

لہٰذا ثابت ہوا کہ شیعوں کا کلمہ در جنت کے کلمہ کے مطابق ہے اسی کے مطابق سردارانِ جنت کے شیعہ اہلبیتؑ کے دشمنوں پر لعنت کرتے ہیں۔ اس موضوع پر تفصیلی بحث کیلئے میری کتاب "شیعہ مذہب حق ہے" کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

گیارہواں سوال

سوال نمبر ۱۱: "نعرۂ تکبیر" "نعرۂ رسالت" کے بجائے "نعرۂ حیدری" کثرت سے کیوں لگاتے ہو؟

جواب نمبر ۱۱: یہ بھی شکر ہے کہ آپ نے کم سے کم یہ تو مان لیا کہ ہم "نعرۂ تکبیر" اور "نعرۂ رسالت" کے مخالف نہیں ہیں۔ باقی رہی نعرۂ حیدری کی کثرت تو التماس یہ ہے کہ رواج اور تاریخ اسلام سے پتہ چلتا ہے کہ نعرہ کو موقع و محل کے مطابق استعمال کیا جاتا ہے۔ یعنی جتنی اسلام اور مشرکین کے درمیان لڑائیاں ہوئیں۔ وہاں "نعرۂ تکبیر" لگایا گیا۔ کیونکہ وہ لوگ اللہ کی وحدانیت کو نہ مانتے تھے اور مسلمان اپنے ایمان باللہ کا اظہار خدا کی توحید کی تبلیغ کے لئے "اللہ اکبر" کا نعرہ لگاتے ہیں اور دشمنانِ دین اپنے بتوں کے نعرے لگاتے تھے۔ اس طرح اللہ کا نعرہ بلند ہو کر اشاعتِ توحید کا سبب ہوتا ہے۔

اسی طرح جب مسیلمہ کذاب نے نبی ہونے کا دعویٰ کیا تو مسلمانوں نے اس کے خلاف جنگ کی۔ اس لڑائی میں نعرۂ رسالت بہتات سے لگایا گیا۔ فریقِ مخالف نے اپنے نبی کے نعرے لگائے۔ کیونکہ جھگڑا نبوت و رسالت کا تھا اس لئے اشاعتِ رسالت کی ضرورت صرف نعرۂ رسالت ہی سے پوری ہو سکتی تھی۔ لہٰذا مسلمانوں نے نعرۂ رسالت لگایا۔

بعینہٖ جب باغی شام معاویہ بن ابوسفیان اور خلیفہ برحق حضرت علی علیہ السلام کے درمیان جنگیں ہوئیں تو طرفین نے اپنے تسلیم کردہ

امیرِ خلیفہ کے نعرے لگائے۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ نعرۂ علی علیہ السلام کی مخالفت وہی لوگ کر سکتے ہیں جو حضرت علی علیہ السلام کی مخالف جماعت سے تعلق رکھتے ہوں۔ اس نعرہ کی مخالفت اس کے منہ سے زیب نہیں دیتی جو حضرت علیؑ کو خلیفہ تسلیم کرتا ہو۔ (آج کل ملک میں پاکستان زندہ باد، قائدِاعظم زندہ باد کے ساتھ ساتھ پاکستان پیپلز پارٹی اپنے چیئرمین کا نعرہ "قائدِ عوام زندہ باد" بھی لگاتی ہے۔ جب کہ مولا علیؑ کا نعرہ نہ صرف انسان و مسلمان لگاتے ہیں بلکہ کتب اہلسنت سے نعرۂ حیدری "نعرۂ رضوان" ثابت ہے) کفایۃ الطالب فقیہہ الحرمین اہل سنت محدث شام ابوعبداللہ محمد بن یوسف گنجی شافعی مطبوعہ عراق طبع ۱۹۲۶ء صفحہ ۱۴۶ پر لکھا ہے کہ

نادی ملک السماء یوم بدر یقال له رضوان لا سیف الا ذوالفقار و لا فتی الا علی۔ یعنی رضوان فرشتے نے جنگِ بدر کے دن ندا دی ذوالفقار کے سوا کوئی تلوار نہیں اور علی علیہ السلام کے سوا کوئی جوان نہیں۔ اسی طرح شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے مدارج النبوۃ میں نعرۂ حیدری کا ذکر کیا ہے کہ

شاہِ مرداں، شیرِ یزداں قوتِ پروردگار

لا فتیٰ الا علی لا سیف الا ذوالفقار

نیز یہ کہ بی بی عائشہ کی بیان کردہ حدیثِ رسولؐ کے مطابق ذکرِ علیؑ عبادت ہے اس لئے نعرۂ حیدری یا علیؑ باعثِ برکات و ثواب ہے۔ اور چونکہ آپ لوگ نعرۂ تکبیر اور نعرہ رسالت کی اتنی مخالفت نہیں کرتے جتنی نعرۂ حیدری کی کرتے ہیں لہٰذا اصولِ نعرہ بازی کے مطابق ہمیں نعرہ حیدری یا علیؑ لگا کر اشاعتِ ولایت علی علیہ السلام کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ یہ نعرہ اولیاء کا وظیفہ ہے۔ ملاحظہ فرمائیں "آپ کا کیا حال ہے؟"

جو اپنے رسولؐ بھائی کا مصیبتوں میں مددگار رہا آج بھی وہ انسانوں کی مشکل کشائی کرتا ہے میدان جنگ میں جب اس کے نام کو پکارا جاتا ہے تو فتح قدم چوم لیتی ہے۔ اس کے نام کا نعرہ سن کر مخالفین کے دل بیٹھ جاتے ہیں قدم اکھڑ جاتے ہیں۔ نعرۂ حیدری "یا علیؑ" کی گونج سے فضا میں کیف و مستی پیدا ہو جاتی ہے روح کو سرور ملتا ہے۔ چہرہ کی رونق دوبالا ہو جاتی ہے۔ دشمن کا رنگ اڑ جاتا ہے۔ اطمینان قلب نصیب ہوتا ہے۔ عاشقوں کے لئے سامان راحت ہے طالبوں کے لئے مقصود ہے۔ گناہوں کا کفارہ ہے، جنت کی ضمانت ہے۔ دوزخ سے بچنے کا یقینی ذریعہ ہے روحانیت کی جلاء اور مادیت کی تلاش کا واحد وسیلہ ہے۔ نجات کا حتمی حیلہ ہے۔

نعرہ "یا علی" اللہ کا نعرہ ہے

"حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ حضور اکرمؐ نے فرمایا کہ اللہ اور مقرب فرشتے علیؑ پر ہر روز فخر کرتے ہیں حتیٰ کہ خدا نعرہ بلند کرتا ہے شاباش یا علیؑ" (دیلمی)

معلوم ہوا کہ نعرہ حیدری مخلوق کا نہیں بلکہ خالق کائنات کا نعرہ ہے جسے ہر روز بلند کیا جاتا ہے۔

بارہواں سوال

سوال نمبر ۱۲: خدا کے علاوہ کسی سے مدد مانگنا شرک ہے اس لئے "یا علیؑ مدد" کہنا کیونکر درست ہے؟

جواب نمبر ۱۲: علی علیہ السلام سے مدد مانگنا جائز ہے۔ سرکارِ کائناتؐ کی سنت قولی بھی ہے اور فعلی بھی ہے۔ اس کا اعتراف عملی طور پر شیخین نے بھی کیا ہے۔ ارشاد ربّ العزت ہے کہ — "بس اللہ تمہارا ولی ہے اور رسولؐ اور وہ مومن جو نماز کو قائم کرتے ہیں اور حالتِ رکوع میں زکواۃ دیتے ہیں (سورۂ مائدہ آیت نمبر ۵۵) ہم نے پہلے بیان کیا کہ یہ آیت حضرت علی علیہ السلام کی شان میں نازل ہوئی۔ تمام اہلِ اسلام کو دعوتِ عام ہے کہ ثابت کر دیں کہ علی علیہ السلام کے سوا کسی دوسرے بزرگ کی شان میں نازل ہوئی ہو۔ اگر نہ کر سکیں تو خدا اور رسول صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے اس حکم کو بسر و چشم تسلیم کر لیں کہ اللہ مددگار ہے، رسول مددگار ہیں اور علیؑ مددگار ہیں۔ کیونکہ ولی کے معنوں میں مددگار بھی ہے۔ اس کا منکر کلام الٰہی کا منکر اور اللہ کے کلام کا منکر کافر ہے۔ اسی آیت سے اگلی آیت اس طرح ہے کہ،

"جو مددگار مانے گا اللہ کو، رسولؐ کو اور ان ایمان والوں کو (جو حالتِ رکوع میں زکواۃ دیتے ہیں) بے شک وہ گروہ غالب ہے (سورہ مائدہ آیت ۵۶)

اس آیت سے ثابت ہوا کہ غلبہ پانے کے لئے اللہ، رسولؐ اور علیؑ سے مدد مانگنا کوئی گناہ نہیں بلکہ ربّ العالمین کے منشا کے مطابق ہے۔ کلام اللہ بالکل واضح اور روشن الفاظ میں اس کی تائید کرتا ہے جو لوگ "ولی" کے معنی "دوست" لیتے ہیں ان کے لئے کہوں گا کہ "دوست وہ جو مصیبت میں کام آئے۔"

سرکارِ نبوتؐ نے تو جنگوں میں علیؑ سے مدد طلب کر کے اسے سنت ہی بنا

دیا ہے جس سے انکار محال ہے۔ شبِ ہجرت حضورؐ کے بستر پر تلواروں کے سائے میں سونا، جنگوں میں علمدارِ رسولؐ ہونا اس کا ثبوت ہے اور شیخ محدث عبدالحق دہلوی نے مدارج النبوۃ میں نادِ علی علیہ السلام کا ذکر کر کے آنحضرتؐ کا حضرت علیؑ کو پکارنا ثابت کیا ہے۔

اس امر سے یہ تاثر نہ لیا جائے کہ نبی معاذ اللہ حضرت علیؑ کے محتاج تھے بلکہ حضورؐ کا مقصد محض اُمت پر افضلیت علیؑ ظاہر کرنا تھا اور یہ تاثر کہ خدا کے علاوہ اور کوئی کارساز یا فضل کا حامل نہیں ہے از روئے قرآن غلط ہے کہ سورۂ حدید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

"اہلِ کتاب یہ نہ سمجھیں کہ یہ مومنین خدا کے فضل پر کچھ قدرت نہیں رکھتے یہ تو یقینی بات ہے کہ فضل خدا ہی کے قبضے میں ہے (مگر) وہ جس کو چاہے عطا کرے اور خدا تو بڑا فضل کا مالک ہے۔" (سورۂ حدید ۲۹)

پس ثابت ہوا کہ خدا تعالیٰ نے مومنین میں سے کچھ مصطفیٰ و مرتضیٰ ہستیوں کو "ولی" بنا کر یہ طاقت عطا کی ہے کہ ان کو خدا کے عطا کردہ فضل پر تصرف حاصل ہے۔ لہٰذا ان سے مدد مانگنا شرک نہیں ہے اور ان کی اس عطا کردہ طاقت منجانب خدا کا انکار خدا کو ہرگز پسند نہیں ہے جیسا کہ آیت کے الفاظ سے ظاہر ہے۔

اسی لئے حضرت ابوبکر نے کہا کہ "اگر فتنہ زکواۃ میں علیؑ میری مدد نہ کرتے تو میں ہلاک ہو جاتا" تاریخ عبدالقادر صفحہ ۲۷) حضرت عمر کا قول ہے کہ "اگر علیؑ نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو جاتا۔" ذکر حسین مولوی کوثر نیازی۔

حضرت عثمان کی مدد جس قدر بسلسلۂ پانی حضرت علیؑ نے کی ہے تاریخ اس کی شاہد ہے جب اتنی بڑی شخصیتیں علیؑ کی امداد و اعانت کی معترف ہیں تو پھر عام معترضین کی کیا حیثیت ہے؟ اپنے صدیق اکبر کی صداقت اور قرآن و حدیث کی حقانیت پر اعتبار کیجئے اور "یا علیؑ مدد" پر اعتراض کرنا چھوڑ دیجئے۔ کیونکہ فرمانِ رسولؐ ہے کہ "من کنت مولاہ فھذا علی مولاہ" متفقہ حدیث ہے کہ جناب رسولِ خداؐ صرف اصحاب ہی کے نہیں بلکہ پوری کائنات کے مولا ہیں۔ اس لئے علیؑ بھی سب کے مولا ہیں۔

تیرہواں سوال

سوال ۱۳: حضرت علیؑ کے گھر نبیؐ کی ایک صاحبزادی اور حضرت عثمان کے گھر دوؔ، پھر حضرت علیؑ کو حضرت عثمان سے افضل سمجھنا کیونکر درست ہے؟

جواب ۱۳: اس سلسلے میں پہلی عرض یہ ہے کہ اسلام میں معیارِ فضیلتؔ یہ نہیں ہے کہ فلاں شخص نبی کا رشتہ دار ہے یا قرابت دار ہے بلکہ شرط تقویٰ ہے اس لئے دو بیٹیوں یا ایک بیٹی کا سوال ہی پیدا کرنا اصولاً غلط ہے۔ دوم یہ کہ جب بیٹی کی کوئی فضیلت نہ ہو تو داماد کی فضیلت کیسی آپ حضرات فیصلہ کیجیے کہ احادیث و اخبارِ رسولؐ میں جس قدر فضیلت جناب سیدہ فاطمہؑ کی ظاہر ہوئی ہے کیا کسی اور بیٹی کی ہے؟ صرف ایک حدیث بخاری شریف سے نقل کرتا ہوں۔ الفاطمۃ سیدۃ النسا اہل جنت یعنی فاطمہؑ جنت کی تمام عورتوں کی سردار ہے۔ اس محیط میں تمام معصوم و غیر معصوم عورتیں شامل ہیں اور یہی حدیث یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ جناب فاطمہؑ کا درجہ سب عورتوں سے بلند ہے۔ اسی طرح کی احادیث کتب اہل سنت والجماعت اور شیعہ میں ملتی ہیں اب آپ ان احادیث کے مقابلے میں جو شان بتولؑ میں ہیں کسی اور صاحبزادی کی شان میں دکھا دیں تو ہم آپ کا اعتراض معقول ماننے کو تیار ہیں حالانکہ حضورؐ کی کوئی دوسری حقیقی بیٹی تھی ہی نہیں۔ جب وہ بیٹیاں ہی نہیں تو نور کیسے؟ اور جب وہ نور نہیں تو حضرت عثمان ذوالنورین کیونکر؟ اسی طرح صدیق اکبر اور فاروق اعظم کے خطابات رسولِ خداؐ نے حضرت علی کو عطا کئے اور یہ پوری بحث ہم نے اپنی کتاب "وحی رحمۃ اللعالمینؐ" میں کی ہے مطالعہ فرمایا جائے۔

حاشیہ ۱: جب رشتہ داری معیارِ فضیلت نہیں ہو سکتی تو محض صحبتِ پیغمبر کیوں معیارِ فضیلت ہو؟

حضرت علی علیہ السلام کو اس لحاظ سے فضیلت نہیں کہ وہ رشتہ میں دامادِ رسولؐ ہیں بلکہ ان کے ذاتی کارناموں قرآنی آیات اور احادیثِ رسولؐ سے خیالِ برتر ملتے ہیں اور اس لئے امیر المومنین علیؑ ابن ابیطالب کو حضورؐ کے بعد سب سے افضل سمجھتے ہیں کہ سرکارِ دو عالمؐ کے ارشاد کے مطابق حضرت علیؑ نورِ محمدؐ سے ہیں۔ یہ وہ فضیلت ہے جو نہ عثمان کو حاصل ہوئی نہ ہی شیخین کو حدیث نور کتب اہل سنت میں ملاحظہ ہو مثلاً تذکرہ خواص الامۃ سبط ابن جوزی ۲۸۔ فردوس الاخبار دیلمی، مناقب امام احمد بن حنبل، ینابیع المودۃ سلیمان قندوزی، مناقب مرتضوی محمد صالح چشتی، ارجح المطالب بسمل وغیرہ۔

حقیقت یہ ہے کہ جناب امیر المومنین علیہ السلام کے سوائے کسی بھی شخص کو شرفِ دامادئ رسولؐ ہرگز حاصل نہ تھا۔ اس کا ثبوت خود سرورِ کائناتؐ کی حسب ذیل حدیث سے ملتا ہے۔ جو کتب اہل سنت میں منقول ہے۔

عن ابی الحمراءؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لعلی اوتیت ثلثا لم یؤتہن احد ولا انا اوتیت صہراً مثلی ولم اوت انا مثلی واوتیت زوجۃ صدیقۃ مثل ابنتی ولم اوت مثلہا زوجۃ واوتیت الحسن والحسین من صلبک ولم اوت من صلبی مثلہا ولکنکم منی وانا منکم۔

ترجمہ: ابوالحمراء سے روایت ہے کہ جناب رسالت مآبؐ نے علی علیہ السلام سے فرمایا تجھے تین باتیں ایسی دی گئی ہیں کہ کسی ایک کو بھی نہیں دی گئیں یہاں تک کہ مجھے بھی نہیں۔

۱۔ تجھے مجھ سا خسر دیا گیا ہے اور مجھے ویسا نہیں دیا گیا۔
۲۔ تجھے میری بیٹی صدیقہ زوجہ ملی ہے اور مجھے ویسی زوجہ نہیں ملی۔
۳۔ حسنؑ و حسینؑ جیسے فرزند تیری پشت سے تجھے دیئے گئے ہیں اور میری پشت سے مجھے ویسے نہیں دیئے گئے لیکن تم مجھ سے ہو اور میں تم سے ہوں۔

روایت اہل سنت اخرجہ ابو سعد فی شرف النبوۃ، الدیلمی فی فردوس الاخبار امام علی الرضا فی مسند بحوالہ ارجح المطالب ج ص ۶۹۲ مولفہ مولوی عبید اللہ بسمل امرتسری۔

الغرض بنازعہ بنات النبی کو حل کرنے کے لئے حدیث متذکرہ بالا سے استدلال ہی کافی ہے۔ علاوہ ازیں قابل توجہ امر یہ ہے کہ حضرت عثمان کا لقب "ذوالنورین" کتب صحاح سے بزبان رسولؐ مرفوعاً ثابت نہیں کیا جاسکتا ہے۔ پس جب مبینہ بیٹیاں ہی نور ثابت نہیں ہوتی ہیں تو پھر داماد کو "دو نوروں والا" کیسے تسلیم کیا جائیگا۔

نکتہ خاص یہ ہے کہ اکثر مسلمان رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو "نور" نہیں مانتے۔ اور آپ کو بشر عام سمجھتے ہیں لیکن تعجب ہے کہ حضورؐ کو تو خاکی تصور کرتے ہیں مگر ان کے نام نہاد داماد کو دو نوروں والا مانتے ہیں۔ یہ منطق ناقابل فہم ہے شاید "دروغ گو را حافظہ نہ باشد" والا معاملہ ہے۔

حدیث بالا سے ثابت ہے کہ اگر حضرت عثمان کو یا عتبہ بن ابولہب اور عتیبہ بن ابی لہب کو بھی شرف دامادی حاصل ہوتا تو سید الانبیاء کی زبان وحی سے یہ الفاظ ادا نہ ہوتے کہ یہ حضرت علیؑ ہی کی خصوصیت ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے خسر ہیں اور یہ خصوصیت حضرت علیؑ کے سوا کسی اور کو نہیں دی گئی ہے۔ پس تسلیم کرنا چاہیئے کہ حضرت فاطمہ زہراؑ کے سوا رسولؐ کی کوئی حقیقی بیٹی نہیں تھی۔ مزید برآں کہ کتب اہل سنت سے ثابت ہے کہ مبینہ بیٹیاں حضورؐ کی حقیقی بیٹیاں نہیں تھیں جیسا کہ کتاب الاستغاثہ ۳ھ میں ابوالقاسم الکوفی متوفی ۳۵۲ھ نے تحریر کیا ہے۔

فلما تزوج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بخدیجۃ مات ہالۃ بعد ذلک بعدۃ یسیرۃ وخلفت الطفلتین زینب ورقیہ فی حجر رسول

اللہ صلی علیہ وآلہ وحجر خدیجۃ فربیاھما وکان من سنۃ العرب الجاہلیۃ من یربی یتیماً ینسب ذلک الیتیم الیہ۔

ترجمہ:- جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت خدیجہؓ سے عقد فرمایا تو اس کے تھوڑے عرصہ بعد ہالہ کا انتقال ہوگیا اور اس نے دو لڑکیاں چھوڑیں ایک کا نام زینب تھا اور ایک کا نام رقیہ تھا۔ اور ان دونوں نے پیغمبرؐ اور خدیجہؓ کی گود میں پرورش پائی۔ اور ان ہی نے ان کی تربیت کی۔ اور اسلام سے قبل یہ دستور تھا کہ اگر کوئی یتیم بچہ کسی کی گود میں پرورش پاتا تھا تو اسے اسی کی طرف منسوب کر دیا جاتا تھا۔ (اسی رواج کے مطابق حضرت زید بن حارث کو زید بن محمد پکارا جانے لگا کہ خدا کو قرآن میں اس کی تردید کرنا پڑی)

واضح ہو کہ ہالہ جناب خدیجۃ الکبریٰؑ کی ہمشیرہ تھیں اور زینب و رقیہ جناب ہالہ کی یتیم بچیاں تھیں جن کی پرورش حضرت خدیجہؑ اور سرکار محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمائی۔ اور عرب کے دستور کے مطابق دونوں کو حضورؐ اور بی بی خدیجہؑ کی بیٹیاں کہہ دیا گیا۔ علاوہ ازیں اہل سنت کے علماء کے نزدیک اس امر پر اتفاق نہیں ہے کہ مبینہ بیٹیاں واقعی رسول کی سگی صاحبزادیاں تھیں۔ ملاحظہ فرمائیں۔ سیرۃ ابن ہشام جلد چہارم ص ۲۹۳ باب فی ذکر ازواجہ۔

تاریخ الخمیس میں علامہ حسین دیار بکری نے زینب کو ابوہالہ ہی کی بیٹی لکھا ہے (دیکھئے تاریخ خمیس جزو ۱ ص ۲۹۷ مطبوعہ مصر)

اسی طرح علامہ اہلسنت امام حافظ ابن حجر عسقلانی نے الاصابہ فی تمیز الصحابہ جلد ۴ جزو ۸ ص ۲۷۳ پر ام کلثوم کو ربیبہ یعنی پالی ہوئی تحریر کیا ہے۔

قرآن مجید میں جو لفظ "بنات" آیا ہے وہ بھی یہ ثابت نہیں کرتا کہ وہ حضورؐ کی بیٹیاں تھیں۔ کیونکہ قرآن میں اکثر واحد کے لئے جمع کا صیغہ استعمال ہوا

ہے۔ جیسا کہ آیۂ مباہلہ میں نسانا جمع ہے لیکن حضورؐ نے عملی طور پر جناب سیدہؑ کو ہی مراد لیا اور محض واحد ہی کو لے کر گئے۔ اسی طرح حضرت لوط علیہ السلام کی دو بیٹیوں کے لئے تثنیہ کے صیغے کی بجائے جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے اور اگر واحد جمع کی بحث کا اصرار ہے تو ہم کہیں گے "بنات" میں دختران جناب سیدہ شمار ہوں گی جیسا کہ ابناءنا میں حسنؑ و حسینؑ فرزندانِ فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کو عملی طور پر جناب رسولِ خداؐ نے مراد لیا۔ اسی کے مطابق ہم شیعانِ علی کی کتاب "تحفۃ العوام" میں جو زیارت درج ہے جس میں سلام آیا ہے وہاں بھی دخترانِ جناب امیر علیہ السلام مراد ہیں علامہ مجلسی نے جو حیات القلوب میں بیٹیوں کا ذکر کیا ہے وہ زبیر بن بکار کی روایت ہے اور زبیر مذکور دشمن اہلبیتؑ تھا۔ لہٰذا وہ روایت قابلِ قبول نہیں ہے جب کہ اس کے خلاف قطعی ثبوت پیش کئے جا چکے ہیں۔

اور آخر میں عرض یہ ہے کہ مسئلہ بنات النبی متنازعہ فیہ ہے اور جب تک تنازعہ و اختلاف موجود ہے اس وقت تک اہلِ سنت کی طرف سے بطور حجت پیش نہیں کیا جا سکتا کیونکہ حجت فریق مخالف کے مسلمات سے قائم کی جاتی ہے حالانکہ مسئلہ بنات النبی میں شیعہ تو رہے ایک طرف خود سنی مورخین و علماء کا اختلاف ثابت ہے۔ لہٰذا امر متنازعہ کو بطور دلیل پیش کر کے حضرت عثمان کی فضیلت ثابت کرنے کی کوشش اصولی طور پر درست نہیں ہے۔

چودھواں سوال

سوال ۱۴ تم لوگ صحابہ کرام خصوصاً حضرت ابوبکرؓ عمرؓ اور عثمانؓ کو حضرت علیؑ کے برابر کیوں نہیں سمجھتے؟ جب کہ چاریارانِ نبیؐ ہم مرتبہ ہیں؟

جواب ۱۴ کسی ایک شخص کی فضیلت بیان کرنے سے کسی دوسرے کی فضیلت میں کمی نہیں آتی بشرطیکہ وہ دوسرا واقعی فضیلت رکھتا ہو۔ اب آیئے کراجکی صاحب کی تحقیق سے کچھ استفادہ حاصل کریں۔ رسالہ "التفضیل" میں صـ۳ پر علامہ صاحب لکھتے ہیں:-

الذی ذھب الیہ فی ذالک ھو ان امیر المؤمنین علی بن ابیطالب صلوات اللہ علیہ افضل من جمیع البشر من تقدم ومن تاخر سوی رسول اللہ وعلی ھذا القول اجماع الشیعۃ الامامیہ ولم یخالف فیہ منھم الا الاصاغر والذین .... الخ

"ہمارا خیال ہے کہ امیر المومنین علیؑ بن ابی طالب سوائے جناب رسول خداؐ کے انسانی سلسلہ کے ہر فرد و بشر سے افضل ہیں شیعہ امامیہ کا اس عقیدہ پر اتفاق ہے اس میں چند معمولی آدمیوں نے اختلاف کیا ہے جن کا قدم صاف راستے سے ڈگمگا گیا ہے۔

فضیلت کے معنی اور اس کی وسعت

فضیلت کے معنی "زیادتی یا اضافہ" ہیں۔ اگر کسی شخص میں دوسرے شخص کے مقابلے میں کوئی خوبی زیادہ ہو تو اسے افضل کہتے

ہیں۔ فضیلت کے مختلف درجے اور معیار ہیں۔ جو شخص فضیلت کے جس بلند معیار پر پہنچا ہے تاریخ اسی قدر اسے سراہتی ہے۔

۱۔ کبھی فضیلت کسی شخص فعل چیز کی ماہیت میں داخل ہوتی ہے مثلاً فریضہ کی ماہیت میں داخل ہے اس لیے نوافل کے مقابلے میں افضل ہے عام پتھر کے مقابلے میں موتی افضل ہے۔

۲۔ نیت کے لحاظ سے بھی فضیلت کی شاخیں پھوٹتی ہیں مثلاً دو شخص ایک ہی کام کر رہے ہیں ایک کے عمل کا محرک خلوص ہے اور دوسرے کا ریاکاری اس معیار پر مخلص کا عمل افضل ہوگا۔

۳۔ کیفیت بھی ایک طرح کے دو کاموں میں فرق پیدا کر دیتی ہے مثلاً ایک کام کو اچھی طرح انجام دیتا ہے اور دوسرا اسی کام کو بُری طرح کرتا ہے۔

۴۔ زمانہ بھی فضیلت کی تقسیم کا معیار بن جاتا ہے۔ بعض وہ کام ہیں جو پہلے کیے گئے ہیں وہ ان کاموں سے افضل ہو گئے جو بعد میں کیے گئے مثلاً ایک شخص اسلام کے بالکل آغاز میں ہی اسلام کے حلقہ بگوش ہو جاتا ہے اور دوسرا فتح مکہ کے بعد مسلمان ہوتا ہے یا جو عبادت ماہِ رمضان میں کی جاتی ہے وہ اس عبادت سے افضل ہے جو سال کے کسی اور دن کی جائے۔

۵۔ زمانہ کی طرح جگہ کو بھی فضیلت کے تصور میں دخل ہے۔ جو نماز حرم کعبہ میں پڑھی جائے وہ عام مساجد کی نماز سے افضل ہے علامہ موصوف نے فضیلت کی ایک سادہ تقسیم کی ہے۔

ا۔ وہ فضیلت جو اللہ کا عطیہ خاص ہے۔

ب۔ وہ فضیلت جو انسان اپنے عمل و سعی سے حاصل کرتا ہے۔

الغرض ہم فضیلت کے جن جن گوشوں پر نظر ڈالتے ہیں ان راہوں میں حضرت علی علیہ السلام کے قدموں کے درخشاں نشانات نظر آتے ہیں۔

حضرت علیؑ اور قدرتی فضیلتیں

قرآن حکیم میں آیت مباہلہ (سورۂ آل عمران) کی رُو سے حضرت علیؑ رسول اللہؐ کے نفس ثابت ہیں۔ تمام عالم اسلام اس پر متفق ہے کہ رسولؐ ہر ادنیٰ و اعلیٰ سے افضل ہیں، جسے نفسِ رسولؐ کی حیثیت حاصل ہو وہ بھی ہر انسان و بشر سے افضل ہوگا۔ رسولِ خداؐ نے عملی کیفیت کے علاوہ قولی طور پر بھی علیؑ کو اپنا نفس فرمایا ہے دیکھیے۔ خصائص نسائی حافظ ابو عبدالرحمٰن بن شعیب متوفی ۳۰۳ھ لا بعثن رجلا کنفسی۔

اس کے علاوہ حدیث مواخاۃ، حدیث طیر، حدیث مدینۃ العلم، تشبیہ، حدیث خیر البشر وغیرہ سے علامہ موصوف نے افضلیت علیؑ کو ثابت کیا ہے۔ ان تمام احادیث کو دیکھا جائے تو علیؑ کی شخصیت میں اسلام کے عین مطابق وہ تمام کمالات اور خوبیاں دکھائی دیتی ہیں جو خدا کے تفضل اور انسان کی ذاتی کوششوں سے ہیں جنہیں انسانیت کی معراج کہا جا سکتا ہے۔

یہ حدیثیں بیان فضیلت کے لحاظ سے نہایت واضح ہیں۔ مثلاً ترمذی ۲۱۳/۲ میں حضرت عمر انس بن مالک زید بن ابی ابن عباس ابن مسعود، زید بن ارقم، جابر بن عبداللہ انصاری، عبداللہ بن عمر وغیرہم سب حضرات سے مروی ہے کہ:

(۱) رسولِ خدا نے اخوت کا رشتہ مسلمانوں کے درمیان قائم فرمایا حضرت ابوبکر و عمر، عثمان و عبدالرحمان بن عوف، طلحہ و زبیر، حضرت ابوذر و سلمان فارسی، جناب فاطمہؑ اور ام سلمہؓ، ام المومنین عائشہ اور زوجۂ ابو ایوب انصاری کے درمیان اس رشتۂ اخوت سے سرکار دو عالمؐ نے عربی و عجمی، امیر و غریب، آزاد و غلام وغیرہ کے فرق کو مٹا کر مساوات کی بنیاد رکھی لیکن باوجود پُر خلوص اور جلیل القدر اصحاب کے سرورِ کائناتؐ نے کسی سے اپنا رشتۂ اخوت قائم نہ کیا سوائے علیؑ کے اور فرمایا علی میرا دنیا میں بھی بھائی ہے اور آخرت میں بھی رسولِ خداؐ نے

جس جس کو مناسب سمجھا بھائی بھائی بنا دیا۔ حضورؐ سب سے افضل ہیں جسے آپ خود اپنی صفات کا نمونہ کہیں اور اسے مخصوص طور پر بھائی فرمائیں، وہ افضل کیوں نہ ہوگا؟ لہٰذا حضورؐ کے علاوہ حضرت علیؑ سب سے افضل ہیں۔

(۲) ابن عباس اور انس بن مالک سے روایت ہے: "اتی النبی بطیر فقال اللھم ائتنی باحب خلقك الیك فجاء علی فقال اتی وکل" معجم کبیر حافظ ابوالقاسم سلمان بن احمد طبرانی ارجح المطالب ۵۲۴)

"یعنی جناب رسول مقبولؐ کے پاس ایک بھنا ہوا پرندہ لایا گیا حضرتؐ نے فرمایا پروردگار اس شخص کو بھیج جو کائنات میں تجھے سب سے پیارا ہے۔ علیؑ آئے۔ اور رسولِ خداؐ نے فرمایا۔ آؤ کھاؤ۔"

کسی کا اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب ہونا کیا کم فضیلت ہے؟ اگر علیؑ خدا کے نزدیک افضل ہیں تو کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ ان کے مرتبے کو کم کرنے کی کوشش کرے خدا اور رسولؐ سے عداوت مول لے۔

(۳) سرکار رسالتؐ کی فضیلت آپ کے لامحدود علم کی وجہ سے بھی ہے اور یہی فضیلت علیؑ کو پیغمبرؐ کے بعد حاصل ہے۔ چنانچہ کنز العمال علامہ علی متقی بن حسام الدین متوفی ۹۷۵ جلد ۶ صفحہ ۱۵۶ میں ہے کہ:

علیؑ میرے علم کا دروازہ ہے جو پیام میں لے کر آیا ہوں میرے بعد اس کے بیان کرنے والا ہے۔" رسولؐ نے مختلف موقعوں پر جناب امیرؑ کو لوگوں سے بے مثال عالم و حکیم ہونے کی حیثیت سے متعارف کرایا۔ کبھی فرمایا۔

"میں حکمت کا گھر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہے۔" (ترمذی جلد ۲ صفحہ ۲۱۴)

کبھی ارشاد ہوا کہ "میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہے جو علم کا ارادہ رکھے وہ دروازے سے آئے۔" (ینابیع المودۃ) شہر میں دروازہ ہی سے آنا ممکن ہے۔ جو شخص دیواروں وغیرہ کو پھاند کر۔۔۔ جاتے ہیں چور یا ڈاکو سمجھے جاتے ہیں۔

سرکار دوعالم نے اس حدیث میں رات میں سورج کی روشنی دکھا دی ہے کہ جو علوم فضائل اور خواص انبیاء میں جزوی طور پر ہیں علی علیہ السلام میں کُلی طور پر لئے ہیں۔ لہٰذا علیؑ سوائے حضور اکرمؐ کے تمام نبیوں سے افضل ہیں۔ جب انبیاء و مرسلین جیسے معصوم ہادیوں پر حضرت علیؑ کو فضیلت حاصل ہے تو پھر غیر معصوم اصحاب اور دیگر لوگوں کا کیا ذکر؟ چونکہ ہم تمام حوالہ جات کتب اہلسنت ہی سے نقل کر رہے ہیں لہٰذا یہ حدیث بھی ہم نے اہلسنت کے دو مقتدر علماء جناب گنجی شافعی اور کمال الدین شافعی کی کتابوں سے نقل کر کے ہدیہ قارئین کرتے ہیں۔

قولِ رسولؐ ہے۔ "من اراد منکم ان ینظر الی آدم فی علمہ والی نوح فی حکمتہ وعلی ابراھیم فی حلمہ۔ فلینظر الی علی ابن ابی طالب۔"

ترجمہ:۔ جو آدمؑ کو علم کے ساتھ نوحؑ کو حکمت کے ساتھ اور ابراہیمؑ کو حلم کے ساتھ۔۔۔۔ دیکھنا چاہے وہ علیؑ کو دیکھے (کفایت الطالب یوسف گنجی شافعی مطالب السئول شیخ کمال الدین محمد بن طلحہ شافعی)

نوٹ:۔ حدیث موصوف بہت طویل ہے۔ یہ مختصر سا حصہ ناظرین کے لئے کافی ہوگا۔

ہم نے سوال ۲ کے جواب میں حضرت جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہ کی روایت سے حضرت علیؑ کو خیر البریہ بیان کیا ہے۔ اب اسی حدیث پر امام اہلسنت احمد بن حنبل کا بیان مناقب سے لکھتے ہیں کہ امام صاحب فرماتے ہیں کہ حضرت جابر بن عبداللہ سے حضرت علیؑ کے متعلق دریافت کیا گیا تو انہوں نے فرمایا "ذالک خیر البشر"۔ اب یہ واضح بات ہے کہ "خیر البشر" کے مفہوم میں انسان آجاتے ہیں لہٰذا جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو حضرت امیرؑ کے مربی اور مرشد ہیں کے سوا یہ حدیث حضرت علی علیہ السلام کو ہر بشر سے بہتر ثابت کرتی ہے کہ شان امیر المومنینؑ یہ ہے کہ ــــ "بعد از نبی بزرگ توئی قصہ مختصر"

مشہور حدیث ہے کہ "حسنؑ اور حسینؑ جنت کے جوانوں کے سردار ہیں اور ان کے والد علیؑ ان سے افضل ہیں۔" (مشکوٰۃ، کفایۃ الطالب صفحہ ۱۹۹ گنجی شافعی)

حسنین علیہم السلام پر حضرت علیؑ کی فضیلت سے سب متفق ہیں۔ اس حدیث سے بھی حضرت علیؑ کی فضیلت سب انسانوں پر ظاہر ہے۔ جو لوگ کسی بوڑھے کے بارے میں کہتے ہیں کہ فلاں بڈھوں کے سردار ہوں گے تو ان کے لئے یہ کہنا کافی ہے کہ بوڑھا تو کوئی جنت میں جائے گا ہی نہیں۔ سب جوان ہو کر بہشت میں داخل ہوں گے ـــــ رسول اللہ کی متفق حدیث ہے کہ بڑھاپا تکلیف و کمزوری ہے اور جنت اسے کہتے ہیں جہاں کوئی کمزوری تکلیف اور بڑھاپا وغیرہ نہ ہو ـــــ اب ہم خلفاء اہلسنت کے اقوال سے ثابت کرتے ہیں کہ جن میں انہوں نے افضلیت امیرالمومنینؑ کا اقرار کیا۔

فضیلت علیؑ بزبان حضرت ابوبکر

علامہ اہلسنت محب الطبری لکھتے ہیں کہ حضرت ابوبکر نے کہا میں ایسے شخص (علیؑ) پر تقدم نہیں کر سکتا جس کی شان میں رسول خداؐ کو فرماتے سُنا ہے کہ "علیؑ کی منزلت مجھ سے ایسی ہے جیسے میری خدا سے۔" (ریاض النضرہ فی فضائل العشرہ بحوالہ ارجح المطالب صفحہ ۵۸۳) پس اہلسنت کے صدیق اکبر کے مطابق جناب امیرؑ کا بمنزلہ حضورؐ کے خدا سے ہونا ثابت ہوا۔

حضرت عمر کا اعتراف اور شان علیؑ

حضرت عمر نے بارگاہ خداوندی میں عرض کی "اے پروردگار! مجھ پر ایسی سختی نازل نہ فرما مگر ابوالحسنؑ (علیؑ) میری دستگیری کو موجود ہوں۔" (ریاض النضرہ جلد ۲ صفحہ ۱۵۶ سفینۂ نوح مولوی شفیع اوکاڑوی صفحہ ۶۶)

لہٰذا فاروق اعظم اہل سنت کے اعتراف سے ثابت ہے کہ علیؑ سختیاں دور کرنے والی مشکل کشا ہستی ہے۔

حضرت عثمان کا اقرار اور مولا علیؑ کی فضیلت

علامہ اہل سنت حافظ ابن عقدہ نے حضرت عثمان سے حدیث غدیر روایت کی ہے کہ عثمان بن عفان نے کہا کہ حضورؐ نے فرمایا "جس جس کا میں مولا ہوں اس اس کا علیؑ مولا ہے۔"

سرکار ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عالمین کے رسول ہیں اور سب کے مولا ہیں پس حضرت امیرؑ بھی کائنات کی ہر مخلوق کے مولا ہوئے خواہ کوئی فرشتہ ہو عام انسان ہو یا نبی پیغمبر۔ اور سرکار رسالت مآبؐ حضرت علیؑ کے مولا ہیں۔

پس خود حضرت ابوبکر و عمر و عثمان ہی کی زبان سے ان پر حضرت علیؑ کی فضیلت ثابت ہو گئی۔ اب ہم آخر میں اپنے مولاؑ کا تعارف ان کی زبانی نقل کر کے قارئین کو دعوت غور و فکر دیتے ہیں۔

شان علیؑ بزبان علیؑ

قائدِ ثقلِ دوم، قرآن ناطق، مولائے کائنات امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام نے مسجد کوفہ کے منبر پر "خطبۃ البیان" ارشاد فرمایا۔

"میں وہ شخص ہوں کہ میرے پاس غیب کی کنجیاں ہیں کہ ان کنجیوں کو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد میرے سوا اور کوئی نہیں جانتا ـــــ میں ہر چیز کی حقیقت سے خبردار اور آگاہ ہوں ـــــ میں وہ شخص ہوں جس کی شان میں رسولِ خدا نے

فرمایا ہے کہ "میں علم کا شہر ہوں اور علی اس (شہرِ علم) کا دروازہ ہے" ——
میں ذوالقرنین ہوں جس کا ذکر کتبِ سماوی میں مذکور ہے جو اس سے پہلے نازل
ہوئیں —— میں ہوں حجرِ مکرّم (بزرگ پتھر) جس سے بارہ چشمے جاری ہوئے
(یعنی دوازدہ ائمہؑ کی امامت) —— میں ہوں وہ شخص جس کے پاس سلیمانؑ
کی انگوٹھی موجود ہے۔ (یعنی میں تمام مخلوقاتِ جن وانس وغیرہ میں متصرف اور
حاکم ہوں) —— میں ہوں وہ شخص جو خلائق کے حساب کا متکفل اور ذمہ دار
ہوا —— میں لوحِ محفوظ ہوں (کہ میرے ضمیر مہر تنویر میں تمام حقائق کونی والٰہی
کی صورتیں ثابت اور قائم ہیں) —— میں لوگوں کے دلوں اور ظاہرہ باطن کی
آنکھوں کو خیر و شر کی طرف پھیرنے والا ہوں۔ ان کا مرجع اور بازگشت ہماری
طرف ہے۔ اور ان کا حساب ہم پر اور ہمارے ذمہ ہے —— میں ہوں وہ شخص جس
سے رسول نے فرمایا "اے علیؑ صراطِ مستقیم تیرا راستہ ہے اور موقف تیرا موقف۔
(یعنی جس چیز پر تو ثابت اور راسخ ہے اسی پر ثابت اور قائم ہونا چاہیئے) یا یہ
کہ پل صراط تیرا صراط ہے اور تو اس کا صاحب اور متصرف ہے۔ جس کو تو چاہے
برقِ خاطف (چمکنے والی بجلی) کی طرح گذار دے اور جناتِ نعیم میں اس کو پہنچا
دے اور جس کو تو چاہے اوندھے منہ درکاتِ جہنم میں بھیجے اور بعض کو عبور و مرور
کی محنتوں اور رنج و آلام میں گرفتار کرے۔ اس اخلاص و مراتبِ اعتقاد کے تفاوت
کے موافق جو تجھ سے رکھتے ہیں اور اسی طرح قیامت کے موقف ہیں اور تجھ سے
متعلق ہیں۔ جس کو چاہے اپنی حمایت کے سائے میں لے کر وہاں کی سختی اور محنت
اس پر آسان کر دے۔ اور بعض کو ایامِ حساب کے (جو پچاس ہزار سال ہیں)
گذرنے کے انتظار کی عقوبت اور عذاب میں مبتلا کرے" —— میں ہوں
وہ شخص جس کے پاس گذشتہ اور آئندہ کے موافق کتابِ خدا کا علم ہے ——
میں ہوں آدمؑ اول، میں ہوں نوحؑ اول، میں ہوں ابراہیمؑ جبکہ آگ میں ڈالے
گئے۔ میں ہوں مومنوں کا مونس اور غمگسار —— میں ہوں سببوں کا کھولنے والا

اور سبب بنانے والا —— میں ہوں بادلوں کا پیدا کرنے والا —— میں ہوں درختوں
کو پتے دینے والا اور ان کو سرسبز کرنے والا —— میں ہوں چشمے نکالنے والا۔ اور
نہروں و ندیوں کو جاری کرنے والا —— میں ہوں زمینوں کا بچھانے والا اور
آسمانوں کا بلند کرنے والا —— میں ہوں وہ شخص کہ میرے پاس فصل خطاب
ہے (یعنی وہ خطاب جو حق و باطل کو جدا جدا کر دے اور درست و غلط میں
تمیز کر دے۔ یا ایسا کلام جو حقائق کے کھولنے اور معارف کے سمجھنے اور سمجھانے میں
نہائت واضح اور ظاہر ہو) —— میں ہوں اہل بہشت پر بہشت کے درجات
اور اہل جہنم پر جہنم کے درکات (یعنی طبقات) تقسیم کرنے والا۔ میں ہوں وحیِ
خدا کی تفسیر و بیان۔ میں (صغائر و کبائر اور خطرات و شکوک سے عمداً اور سہواً)
معصوم ہوں جس کی عصمت خدائے تعالیٰ کی طرف سے ہے —— میں ان لوگوں
پر کہ جو ملائکہ اور نفوسِ قدسی کی جنس سے آسمانوں میں ہیں اور طبقاتِ زمین کے
رہنے والے انس و جن اور ملائکہ ارضی وغیرہ پر خدا کی وحدانیت اور کمالِ قدرت
کی حجتِ قاطع اور برہانِ ساطع ہوں —— میں علم الٰہی کا خزانچی ہوں، میں
ہوں عدل و عدالت سے موصوف اور قائم —— میں ہوں دابۃ الارض جو
قیامت کے علامات و نشانات میں سے ہے —— میں ہوں وہ نفخہ اولیٰ جو زمین
کو زور سے ہلانے اور جنبش میں لانے والا ہے۔ اور میں رادفہ (یعنی نفخہ دوم
اور رادف اس لئے نام رکھا گیا کہ پہلے کے بعد آنے والا ہے جو ردف سے لیا گیا
ہے۔ اور راجفہ رجف سے بنا ہے جس کے معنی شدتِ تحریک ہیں) —— میں
ہوں صیحہ (چیخ) برحق جو کہ خلقت کے باہر نکلنے اور محشور ہونے کے دن ہوگا۔
وہ دن (یعنی روزِ محشر) جس سے آسمانوں اور زمین کی مخلوقات پوشیدہ نہیں۔
—— میں ہوں علیؑ بن ابی طالبؑ جس کی آواز جنگوں میں بجلی کی آوازوں
کی طرح ہے —— میں وہ شخص ہوں جس کو اللہ نے اول اپنی حجت پیدا کیا،
اس کے اطراف پر لکھا کہ اللہ کے سوا کوئی لائقِ عبادت نہیں اور محمدؐ اللہ کے

رسول ہیں۔ اور علیؑ اللہ کے ولی اور وصی رسول ہیں۔ پھر عرش کو پیدا کیا اور اس کے چاروں ارکان پر کلمات مذکورہ لکھے۔ پھر خدا نے طبقاتِ زمین کو پیدا کیا اور اس کے اطراف و جوانب پر کلمات مذکورہ تحریر فرمائے۔ اس کے بعد لوح کو پیدا کیا اور اس کے کناروں پر کلماتِ مذکورہ بالا قلمِ قدرت سے تحریر فرمائے ـــــ میں وہ ساعت ہوں کہ جو شخص اس کو جھٹلائے اور اس کا منکر ہو اس کے لئے دوزخ واجب ہے (اس ساعت سے مراد روزِ قیامت ہے) ـــــ میں وہ کتاب ہوں جس میں کسی قسم کا کوئی شک و ریب نہیں ہے (یعنی قرآنِ ناطق) ـــــ میں خدا کے وہ اسماءِ حسنیٰ ہوں جن کے بارے میں خدا نے ارشاد فرمایا ہے کہ اس کو ان اسمائے سے پکارا جائے ـــــ میں وہ نور ہوں جس سے موسیٰؑ نے روشنی طلب کی تو ہدایت پائی ـــــ دنیا کے محلوں اور عالم کی عمارتوں کو منہدم کرنے والا میں ہوں ـــــ مومنوں کو ان کی قبروں سے نکالنے والا میں ہوں ـــــ میں ہوں وہ شخص جس کے پاس انبیاءؑ علیہم السلام کی کتابوں میں سے ہزار کتابیں موجود ہیں ـــــ میں ہوں وہ شخص جو دنیا کی ہر لغت و زبان میں کلام کرتا ہے ـــــ میں ہوں نوحؑ کا صاحب و رفیق اور ان کا نجات دینے والا اور میں ہوں ایوبؑ کا صاحب جب وہ انواع و اقسام کے رنج و بلا میں مبتلا تھے۔ ان کو ان بلاؤں سے نجات دینے والا اور ان کو شفا عطا کرنے والا میں ہوں۔ اور میں یونسؑ کا صاحب اور نجات دہندہ ہوں۔ میں ہوں جس نے ساتوں آسمانوں کو اپنے نور اور خدا کی قدرت سے قائم کیا ہے ـــــ میں وہ شخص ہوں کہ میرے سبب ابراہیمؑ خلیل پروردگار عالمین پر اسلام لائے اور اس کی بزرگی اور فضل کا اقرار کیا ـــــ موسیٰؑ کلیم اللہ کا عصا میں ہوں۔ اور میں اس کے ذریعے سے تمام مخلوق کی پیشانی کے بالوں کو پکڑنے والا ہوں۔ اور ان پر قابض و متصرف ہوں ـــــ میں وہ شخص ہوں کہ میں نے عالم ملکوت میں نظر کی پس اپنے سوا اور کوئی چیز نہ پائی اور وہ غیر بے شک غائب تھا[1] ـــــ میں

[1] (یعنی میرے مخالفین (اغیار) کا کسی جگہ تصرف عالم ملکوت میں نظر نہ آیا بجز میرا تصرف ہے)

وہ شخص ہوں کہ خلقت کے اعداد اور گنتی کو شمار کرتا اور معلوم کرتا ہوں۔ اگرچہ وہ بہت ہیں اور یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی طرف ان کو پہنچاؤں ـــــ میں وہ شخص ہوں کہ قول اور کلام میرے پاس متغیر اور متبدل نہیں ہوتا اور میں بندگانِ خدا پر ظلم کرنے والا نہیں ہوں ـــــ میں زمین میں خدا کا ولی ہوں اور امرِ خدا میرے سپرد کیا گیا ہے (اولی الامر کا مفہوم یہ ہے) اور میں اس کے بندوں پر حکم کرتا ہوں جیسا کہ فرمایا ہے یا جیسا میں چاہتا ہوں ـــــ میں وہ شخص ہوں کہ میں نے ساتوں آسمانوں کو بلایا۔ انہوں نے میرا حکم قبول کیا۔ پس میں نے ان کو حکم دیا کہ اور وہ قائم ہو گئے ـــــ میں وہ شخص ہوں کہ میں نے نبیوں اور رسولوں کو مبعوث کیا ہے ـــــ میں وہ شخص ہوں کہ میں نے سورج اور چاند کو بلایا ان سے اطاعت طلب کی پس انہوں نے میرا کہنا قبول کیا ـــــ میں نے جملہ عوالم کو پیدا کیا ہے (بحکمِ خدا) ـــــ میں ہوں زمینوں کا بچھانے والا اور تمام ولایتوں کے حالات سے خبردار ہوں ـــــ میں ہوں امرِ خدا اور اس کی روح میں وہ شخص ہوں کہ خدا تعالیٰ نے جس کے دشمنوں کیلئے دو فرشتوں سے فرمایا کہ تم دونوں ہر سرکش ناشکرے کو دوزخ میں ڈالو۔ میں نے پہاڑوں کو زمین کی حفاظت کے لئے لنگر کیا ہے اور مخلوقات کی سکونت کے لئے میں نے زمینوں کو بچھایا ہے۔ اور میں ہوں چشموں کو نکالنے والا اور کھیتوں کو اگانے والا اور درختوں کو بلند کرنے والا اور میووں کو نکالنے والا ـــــ میں ہوں وہ شخص جو لوگوں کے لئے کھانوں کا اندازہ کرتا ہے اور بارش برساتا ہوں اور رعد و برق کی آوازیں سنواتا ہوں ـــــ میں ہوں سورج کو روشن کرنے والا اور صبح کو نکالنے والا اور کشتیوں کو سمندر میں چلانے والا ـــــ میں ہوں وہ شخص کہ قیامت کو برپا کروں گا اور میں ہوں وہ شخص کہ اگر مجھے موت دی جائے تو نہیں مروں گا اور اگر مجھے قتل کیا جائے تو میں قتل نہ ہوں گا ـــــ میں وہ شخص ہوں کہ ساعت و ہر آن میں جو چیز پیدا ہوتی ہے اس کو جانتا ہوں۔ اور میں وہ شخص ہوں کہ ان چیزوں کو جو

دلوں میں گذرتی ہیں جانتا ہوں۔ اور آنکھوں کے جھپکنے کا حال مجھے معلوم ہے۔
اور جو کچھ لوگوں کے سینوں میں پوشیدہ ہے اس کا مجھے علم ہے۔ میں مومنوں کی
نماز ہوں اور ان کی زکواۃ ہوں اور ان کا حج ہوں اور ان کا جہاد ہوں ـــــ
میں ہوں وہ ناقور جس کا ذکر حق تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے "فاذا نقر فی
الناقور" (جب سور پھونکا جائے گا اور نشر اول یعنی اول قبر سے اٹھانے
اور برانگیختہ کرنے کا حساب میں ہوں اور یہ زندہ کرنے سے کنایہ ہے) اور اسی
طرح نشر آخر یعنی عرصات کی طرف زمین کے اٹھانے کا صاحب میں ہوں اور میں
وہ پہلا شخص ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے میرے نور کو پیدا کیا اور میں اور علیؑ ایک
نور سے ہیں[1] ـــــ میں ہوں صاحب کواکب اور دولت کا دور کرنے والا۔
میں ہوں صاحب زلزلہ و راجفہ اور میں ہوں صاحب مقاصد و مطالب اور صاحب
بلایا اور وہ کلام جو حق و باطل میں تمیز اور فرق کر دیتا ہے ـــــ میں ہوں اس
ارم کا صاحب اور مالک جو بڑے عمودوں اور ستونوں والا ہے۔ ایسا ارم کہ
جس کی مثل کسی شہر میں پیدا نہیں ہوا۔ اور وہ میرا ہے اور جو نفیس جواہرات
وغیرہ اس ارم میں ہیں ان کی سخاوت اور ان کو خرچ کرنے والا میں ہوں ـــــ
میں وہ شخص ہوں کہ میں نے ذوالفقار کی سعی و کوشش سے پہلے سرکشوں اور
جباروں کو ہلاک کیا ہے ـــــ میں وہ شخص ہوں کہ میں نے نوحؑ کو اس کشتی میں
سوار کیا جو انہوں نے تیار کی تھی۔ میں وہ شخص ہوں جس نے ابراہیمؑ کو آگ سے
نجات دی اور عالم غربت میں ان کا مونس رہا۔ میں ہوں جو کنوئیں میں یوسفؑ کا
مونس تھا۔ اور میں نے ان کو کنوئیں سے نکالا۔ موسیٰؑ و خضرؑ کا صاحب اور
ان کا تعلیم دینے والا میں ہوں جس نے اسرار الٰہی کے غوامض اور حکمتوں کی
ان کو تعلیم دی ـــــ ملکوت اور عالم کون کے پیدا کرنے کا باعث اور سبب

---

[1] یہ حدیث رسول کا حوالہ دیا ہے اور بتایا ہے کہ حقیقت کے لحاظ سے میں اور رسول خدا
ایک ہی ہیں کیونکہ نور ایک ہے۔

میں ہوں یا ان دونوں کا پیدا کرنے والا میں ہوں ـــــ میں نقصانوں سے
مبرا و منزہ ہوں۔ رحموں میں بچوں کو صورت دینے والا میں ہوں ـــــ
میں وہ شخص ہوں کہ مادر زاد اندھوں کو بینا کرتا ہوں اور برص و جذام
کے مرض کو دور کرتا ہوں۔ اور جو کچھ دلوں میں ہے اس سے واقف ہوں۔
اور میں وہ شخص ہوں کہ تم کو اس چیز سے آگاہ و خبردار کرتا ہوں جو تم
کھاتے ہو اور جو اپنے گھروں میں ذخیرہ کرتے ہو ـــــ میں وہ بعوضہ
ہوں جس کی مثال اللہ تعالیٰ نے قرآن میں بیان فرمائی ہے (یعنی خدا حیا نہیں
کرتا اس بات سے کہ وہ مثل بیان کرے مچھر کی یا اس سے بڑی چیز کی یعنی
اس کی قدرت کی ایک آیت) ـــــ میں وہ شخص ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے
ظلمت اور تاریکی میں میری درخواست اور التماس کو قبول فرمایا ـــــ میں
ہوں وہ شخص کہ اللہ تعالیٰ نے میری حقیقت کو قائم و مہیا کیا جبکہ تمام مخلوقات
ظلمت و نیستی کے بھنور میں گرفتار تھی اور اس مخلوق کو میری اطاعت کی طرف
دعوت دی پس جب وہ ظلمت روشن اور ظاہر ہو گئی اور وہ مخلوقات عالم
وجود میں آ گئیں انہوں نے میری اطاعت و فرمانبرداری سے انکار کر دیا چنانچہ
حق تعالیٰ خود اپنے کلام پاک میں ارشاد فرماتا ہے یعنی پس جس وقت وہ ان
کے پاس آیا انہوں نے اس کی قدر و منزلت نہ پہچانی اور اس کے منکر و کافر ہو
گئے ـــــ میں وہ شخص ہوں کہ میں نے ہڈیوں کو گوشت کا لباس پہنایا ہے
ـــــ میں وہ شخص ہوں جو اپنی اولاد کے نیکوکاروں کے ساتھ عرش خدا کا
اٹھانے والا ہے۔ میں وہ شخص ہوں جو لوائے حمد (حمد کا جھنڈا) اٹھانے
والا ہے۔ میں وہ شخص ہوں جو معنیٔ قرآن اور کتب گذشتہ کی تاویل سے خوب واقف
ہے ہیں علم میں راسخ کیا گیا ہوں ـــــ میں ہوں وہ وجہ اللہ کہ آسمانوں اور
زمین میں وجہ اللہ کے سوائے ہر چیز ہلاک اور فنا ہونے والی ہے۔ میں ہوں جبت
اور طاغوت کا وہ صاحب جو ان کا ہلاک کرنے والا ہے۔ (جبت و طاغوت

سے مراد شیطان اور مشرکوں کے بُت ہیں) —— خدا کا وہ دروازہ ہوں
جس کا ذکر آیۂ "اِنَّ الَّذِیْنَ کَذَّبُوْا ..... الخ میں کیا گیا ہے یعنی "جن لوگوں
نے ہماری آیات کی تکذیب کی اور ان سے سرکشی اور استکبار اختیار کیا ان کے لئے
آسمانوں کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے اور وہ بہشت میں داخل نہ ہوں گے
جب تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں داخل نہ ہو جائے (اور یہ بات محال ہے پس
ان کا بہشت میں داخل ہونا بھی محال ہوگا) ہم مجرموں کو اسی طرح بدلہ دیتے
ہیں" —— میں وہ شخص ہوں کہ جبرئیلؑ اور میکائیلؑ نے میری خدمت کی
ہے۔ میں وہ شخص ہوں کہ میرے لئے آفتاب کو دو دفعہ لوٹایا گیا۔ یعنی واپس
لایا گیا۔ میں وہ شخص ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے جبرئیلؑ و میکائیلؑ کو میری طاعت و
فرمانبرداری کے لئے خاص کیا —— میں ہوں صاحبِ طور، میں ہوں کتاب
مستور، میں ہوں بیتِ معمور، میں ہی حرث و نسل ہوں اور میں وہ شخص ہوں
کہ اللہ تعالیٰ نے میری طاعت اپنی مخلوق میں سے ہر ذی روح اور ہر متنفس پر
فرض کی ہے —— میں وہ شخص ہوں کہ جو مخلوق کے اوّلین و آخرین کو
نشر اور برانگیختہ کروں گا۔ میں ذوالفقار کی کوششوں سے بدبختوں اور بدکاروں
کو قتل کرنے والا ہوں اور ان کے خرمنِ حیات کو آتشِ غضب سے جلانے والا
ہوں —— میں وہ شخص ہوں کہ مجھ کو حق تعالیٰ نے دین پر غالب کیا ہے، میں
ظالموں سے بدلہ لینے والا ہوں میں ہی وہ شخص ہوں کہ جس کی طرف تمام امتوں کو دعوت
دی گئی ہے اور میں وہ شخص ہوں کہ منافقوں کو حوضِ کوثر سے رد کروں گا ——
میں وہ دروازہ ہوں جس کو خدا نے کھولا ہے جو کوئی اس دروازے سے داخل
ہوگا دونوں جہان کے ہر قسم کے مکروہات سے محفوظ اور امن میں رہے گا۔ میں وہ
شخص ہوں کہ بہشت اور دوزخ کی کنجیاں جس کے ہاتھ میں ہیں —— میں ہوں
وہ شخص کہ جبّاروں نے نورِ خدا کے بجھانے اور اس کی حجت باطل کرنے کی کوشش
کی پس اللہ تعالیٰ نے انکار کیا مگر یہ کہ اس کی ولایت اور اس کا نور کامل ہو خدا

نے اپنے پیغمبر کو دریائے کوثر عطا فرمایا اور مجھ کو دریائے حیات عنایت فرمایا۔ میں
زمین میں رسولِ خدا کے ساتھ ہوں۔ پس جس کو چاہا میرا شناسا اور عارف بنایا
اور جس کو نہ چاہا شناسا اور عارف نہ بنایا —— میں وہ شخص ہوں کہ سبزیٔ
ملکوت میں کھڑا ہوں جہاں روحیں حرکت کرتی ہیں وہاں میرے سوا کوئی سانس
لینے والا نہ تھا —— میں خاموشیٔ عالم ہوں اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ
وسلم بولنے والے عالم ہیں —— میں ہوں قرینِ اوّلیٰ کا صاحب، موسیٰؑ سے
مکالمہ اور گفتگو میں نے کی ہے اور میں نے فرعون کو غرق کیا ہے اور یوم ظلّہ کا
عذاب میں ہوں جو بنی اسرائیل پر بھیجا گیا —— میں ہوں رحمتِ خدا کی آیات اور
خدا کا رازدار اور میں زندہ کرتا ہوں اور مارتا ہوں، میں پیدا کرتا ہوں اور رزق
دیتا ہوں۔ میں ہوں سننے والا اور میں ہوں دانا۔ میں ہوں بینا اشیاء کے ظاہر و باطن
کا۔ میں ہوں وہ شخص جو ساتوں آسمانوں اور زمین کے ساتوں طبقوں کی ایک چشم زدن
میں سیر کرتا ہے۔ میں ہوں راجفہ یعنی نفخۂ اولیٰ اور میں ہوں ثانی یعنی نفخۂ ثانی ——
میں امت کا ذوالقرنین ہوں —— میں وہ شخص ہوں کہ صور پھونکوں گا اُس
روز جو کہ کافروں کے لئے بہت سخت ہے۔ اور جس میں بالکل آسانی احتمال نہیں ہے ——
میں ہوں اسمِ اعظم کہ وہ کہٰیعص ہے —— میں ہوں وہ شخص کہ عیسیٰؑ کی
بچپن کی زبان میں گویا ہوا۔ میں ہوں یوسفؑ صدیق۔ میں ہوں وہ شخص جس کی توبہ اللہ
نے قبول کی۔ میں وہ شخص ہوں کہ آخر زمانہ میں عیسیٰؑ میرے پیچھے نماز پڑھیں گے۔
میں مختلف صورتوں میں پلٹنے والا ہوں —— میں ہوں آخرت اور اولیٰ میں ہوں
چیزوں کا پیدا کرنے والا اور ان کو ظاہر کرنے والا۔ میں ہوں ان کا اعادہ کرنے والا۔
اور ان کا حشر کرنے والا۔ میں زیتون کی شاخوں میں سے ایک شاخ ہوں جس کی قسم
خدا تعالیٰ نے قرآن مجید میں کھائی ہے اور میں نبوت کی قندیلوں میں سے ایک قندیل
ہوں کہ شمعِ رسالتؐ کو آفات کی ہواؤں سے محفوظ رکھتا ہوں —— میں ہوں چیزوں
کا ظاہر کرنے والا اور موجودات کا پیدا کرنے والا جس طرح چاہوں —— میں ہوں

وہ شخص کہ بندوں کے عملوں کو دیکھتا ہے مجھ سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں نہ زمین میں نہ آسمان میں ـــــ میں ہوں چراغ ہدایت میں ہوں وہ مشکوٰۃ جس میں محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نور ہے۔ میں وہ شخص ہوں کہ کسی عمل کرنے والے کا عمل میری معرفت کے بغیر کوئی شے نہیں اور پایۂ اعتبار سے ساقط ہے ـــــ میں ہوں آسمانوں اور زمین کا خزانچی کہ سب میری قدرت کے تصرف میں ہیں۔ میں ہوں عدل کا قائم کرنے والا۔ میں زمانے کے ایک حال سے دوسرے حال میں تبدیل ہونے اور اس کے حوادث سے خبردار اور آگاہ ہوں۔ میں ہوں وہ شخص کہ چیونٹیوں کی تعداد اور ان کے وزن اور پہاڑوں کی مقدار اور ان کے وزن اور بارش کے قطروں کے شمار کو جانتا ہوں ـــــ میں اللہ تعالیٰ کی آیاتِ کبریٰ ہوں جو اللہ نے فرعون کو دکھائیں لیکن فرعون نے عصیان اور نافرمانی کی ـــــ میں ہوں وہ شخص جس نے دو قبلوں یعنی بیت المقدس اور کعبہ کی طرف منہ کیا ہے۔ اور میں دو دفعہ زندہ کرتا ہوں۔ اور میں وہ شخص ہوں کہ چیزوں کو جس طرح چاہتا ہوں ظاہر کرتا ہوں ـــــ میں وہ شخص ہوں کہ میں نے کفار کے منہ پر خاک کی مٹھی ڈالی۔ پس وہ واپس ہوئے اور ہلاک ہو گئے۔ اور میں ہوں وہ شخص کہ پہلی امتوں میں سے ستر امت نے میری ولایت کا انکار کیا پس اللہ تعالیٰ نے ان کو مسخ کر دیا ـــــ میں وہ شخص ہوں کہ زمانے سے پہلے ہوں اور خروج کرنے والا ہوں اور آخری زمانے میں ظاہر ہونے والا ہوں ـــــ میں پہلے مشرکوں کی گردنیں توڑنے والا ہوں۔ ان کی سلطنتوں سے ان کو نکالنے والا اور قیامتِ صغریٰ میں ان کو عذاب دینے والا ہوں میں ہوں جبت اور طاغوت کو سزا دینے والا اور ان کو خانہ کعبہ سے نکالنے والا۔ اور یغوث، یعوق اور نسر کو جو مشرکوں کے بت ہیں عذاب دینے والا ہوں ـــــ میں ہوں ستر زبانوں میں بولنے والا، ہر چیز کا ستر طور پر فتویٰ دینے والا۔ میں ہوں وہ شخص کہ جانتا ہوں ہر چیز کو جو رات اور دن میں ایک چیز کے بعد پیدا اور ظاہر ہوتی ہے۔ اور یہ تمام امور سے کنایہ ہے یعنی میں ہر ایک امر کو جو قیامت تک واقع

ہوگا جانتا ہوں ـــــ میں وہ شخص ہوں کہ مشرقوں اور مغربوں میں مخلوقات کے عملوں کو دیکھتا ہوں۔ اور ان کی کوئی چیز مجھ سے پوشیدہ نہیں ہے ـــــ میں وہ شخص ہوں کہ میرے پاس اسمائے اعظم الٰہی سے بہتر اسم ہیں ـــــ میں ہوں کعبۃ الحرام اور بیت الحرام اور بیت العتیق اور میں وہ شخص ہوں کہ اللہ مجھ کو ایک چشم زدن میں مشرق اور مغرب یعنی تمام روئے زمین کا مالک کرے گا ـــــ میں ہوں محمد مصطفیٰ (یعنی نفسِ رسولؐ ہوں)۔ میں ہوں علیؑ مرتضیٰ چنانچہ آنحضرتؐ نے فرمایا علیؑ مجھ سے ظاہر ہوا ہے۔ میں وہ شخص ہوں کہ روح القدس سے میری مدح کی گئی ہے ـــــ میں صاحب فراست ہوں کہ کوئی گناہ اور اشتباہ مجھ پر واقع نہیں ہوتا ـــــ میں وہ شخص ہوں کہ اشیائے موجود کو جس طرح چاہتا ہوں ظاہر کرتا ہوں۔"

(دیکھئے کوکب دری ترجمہ مناقب مرتضوی مصنفہ مولانا محمد صالح حنفی چشتی کشفی باب سوم صفحہ ۱۹۶ تا صفحہ ۲۱۲)

اس کے بعد ہم ایک مشہور واقعہ لکھ کر التماسِ دعا کریں گے۔

اہلِ سنت علماء و خطیب عموماً وعظ و خطبات میں بیان کرتے رہتے ہیں کہ حضرات ثلاثہ اور اہلبیتؑ میں کوئی بھی اختلاف نہ تھا بلکہ اصحابِ ثلاثہ حضرت علیؑ اور اولادِ علیؑ کا انتہائی احترام کرتے تھے۔ چنانچہ روایت ہے کہ ایک روز ابنِ عمر حضرت امام حسن علیہ السلام سے بچپن میں جھگڑ پڑے۔ اور امام حسنؑ نے ابنِ عمر سے کہا کہ تم ہمارے غلام ہو۔ فرزندِ عمر کو یہ بات ناگوار معلوم ہوئی اور انہوں نے یہ ماجرا اپنے والد حضرت عمر بن خطاب سے بیان کیا حضرت عمر اسی وقت قلم دوات لے کر امام حسنؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور عرض کیا کہ فرزندِ رسولؐ یہاں تحریر فرما دیں کہ ہم آپ کے غلام ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ امام نے لکھ دیا۔ اگرچہ امام کا لکھ دینا ثابت نہیں ہے تاہم عرض ہے کہ غلام وفادار بھی ہو سکتا ہے اور بے وفا بھی۔ بلکہ کئی غلام اپنے آقاؤں کے قاتل بھی گزرے ہیں